بینک کی کہانی

غلام حیدر

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

بینک کی کہانی

غلام حیدر

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی۔ 110025

پہلی اشاعت	:	1978
چوتھی طباعت	:	2011
تعداد	:	2100
قیمت	:	-/16 روپئے
سلسلۂ مطبوعات	:	880

Bank Ki Kahani

By

Ghulam Haider

ISBN :978-81-7587-380-3

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی 110025، فون نمبر: 49539000، فیکس: 49539099

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

فون نمبر: 26109746، فیکس: 26108159

ای۔میل: urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in

طابع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا، فیز-II، نئی دہلی-110020

اس کتاب کی چھپائی میں (70GSM, TNPL Maplitho(Top کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

پیارے بچو! علم حاصل کرنا وہ عمل ہے جس سے اچھے برے کی تمیز آجاتی ہے۔ اس سے کردار بنتا ہے، شعور بیدار ہوتا ہے، ذہن کو وسعت ملتی ہے اور سوچ میں نکھار آجاتا ہے۔ یہ سب وہ چیزیں ہیں جو زندگی میں کامیابیوں اور کامرانیوں کی ضامن ہیں۔

بچو! ہماری کتابوں کا مقصد تمھارے دل و دماغ کو روشن کرنا اور ان چھوٹی چھوٹی کتابوں سے تم تک نئے علوم کی روشنی پہنچانا ہے، نئی نئی سائنسی ایجادات، دنیا کی بزرگ شخصیات کا تعارف کرانا ہے۔ اس کے علاوہ وہ کچھ اچھی اچھی کہانیاں تم تک پہنچاتا ہے جو دلچسپ بھی ہوں اور جن سے تم زندگی کی بصیرت بھی حاصل کرسکو۔

علم کی یہ روشنی تمھارے دلوں تک صرف تمھاری اپنی زبان میں یعنی تمھاری مادری زبان میں سب سے موثر ڈھنگ سے پہنچ سکتی ہے اس لیے یاد رکھو کہ اگر اپنی مادری زبان اردو کو زندہ رکھنا ہے تو زیادہ سے زیادہ اردو کتابیں خود بھی پڑھو اور اپنے دوستوں کو بھی پڑھواؤ۔ اس طرح اردو زبان کو سنوارنے اور نکھارنے میں تم ہمارا ہاتھ بٹا سکو گے۔

قومی اردو کونسل نے یہ بیڑا اٹھایا ہے کہ اپنے پیارے بچوں کے علم میں اضافہ کرنے کے لیے نئی نئی اور دیدہ زیب کتابیں شائع کرتی رہے جن کو پڑھ کر ہمارے پیارے بچوں کا مستقبل تابناک بنے اور وہ بزرگوں کی ذہنی کاوشوں سے بھرپور استفادہ کرسکیں۔ ادب کسی بھی زبان کا ہو، اس کا مطالعہ زندگی کو بہتر طور پر سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ
ڈائرکٹر

پیش لفظ

کہانی سے پہلے 7

پہلا باب : پیسہ ۔ روپیہ ۔ دولت 11

کہاں ؟ کب ؟ اور کیسے ؟

قیمتی سکّوں سے کاغذ تک ـــــ پہلا دَور

دَولت کی حفاظت

پیسہ پیسے کو کھینچتا ہے

دوسرا باب : بینک کا پُرانا کاروبار 29

ہمارے مُلک میں دَولت کا کاروبار

یوروپ میں روپیے کا لین دین۔

سونے کا انڈا دینے والی مُرغی

میونسپلٹیوں کے تبادلہ بینک

سُناروں اور مہاجنوں کا راج

کاغذی چکّر

تیسرا باب: نئے بینک۔ شروعات 60

نیا دَور۔ نئے ڈھنگ

نیا بینک

ہمارے بینک کیا کرتے ہیں؟

ہمارے مُلک کے نئے بینک

چوتھا باب: بینکوں کا بینک —— رزرو بینک 86

چوکیدار

کرنسی

حکومت کا بینک

مُلک میں روپے پیسے کا پھیلاؤ

بینکوں کا بینک

بینکوں کے حساب کتاب کی بیباقی

ایک اور چھوٹا سا کام

پانچواں باب: مالک کون؟ 101

کہانی ختم

اِصطلاحیں 119

ایک دن صبح کی خبروں میں اعلان ہوا: "انسان چاند پر پہنچ گیا!" اب گھروں
میں، بازاروں میں، بچوں، جوانوں، بوڑھوں کی زبان پر یہی چرچا تھا۔ کبھی سُنا کہ
'کمپیوٹر' ایجاد ہو گیا ہے جو مشکل سے مشکل حساب کتاب چند لمحوں میں حل کر دیتا
ہے۔ ابھی کچھ دن ہوئے سُننے میں آیا کہ انسان کی بنائی ہوئی مشین ہماری دُنیا
سے کروڑوں میل دُور جا کر مریخ پر اُتر گئی ہے —— تو اس نے فوٹو بھی بھیجنے
شروع کر دیے۔ سائنسی ایجادوں اور انسانی کامیابیوں کی خبریں روزانہ ہی اخبار،
ریڈیو اور ٹیلی ویژن وغیرہ پر آتی رہتی ہیں۔ ہمارے دل میں انسان کے دماغ
اور اس کی سائنسی سمجھ بوجھ کا ایک رعب سا بیٹھ جاتا ہے —— 'انسان بہت
تیزی سے ترقی کر رہا ہے!'

مگر کیا یہ خبر بھی پڑھی ہے تم نے کہ کسی پہاڑی گاؤں میں ایک بہت
بوڑھی ماں کو اُس کے بیٹے کا بھیجا ہوا منی آرڈر پہلی بار مل گیا، خوشی سے
اُس کے آنسو نکل آئے۔ اِس لیے کہ اب تک تو جب کئی کئی سال بعد اُس کا لڑکا
کئی سو میل دُور شہر سے آتا تھا تب ہی وہ اپنی بوڑھی ماں کو پیسے دیتا تھا۔
اور جب پہلی بار انسان کو یہ آسانی محسوس ہوئی ہو گی کہ اس کے گاؤں سے

دس میل دُور لگنے والے بازار کو جاتے وقت اب اُسے کئی کئی بھیڑ بکریوں کو ہانک کر لے جانے کی ضرورت نہیں ہے، یا پانچ سات من گیہوں کا بوجھ اُٹھائے اُٹھائے پھرنے کی پریشانی سے وہ بچ گیا ہے اور اب صرف سونے کا ایک سکّہ یا چاندی کے پانچ سکّے ہی کافی ہو سکتے ہیں، تو وہ کتنا خوش ہوا ہوگا۔ مگر یہ خبر کسی اخبار میں نہیں آئی ہوگی ــــ کیوں؟

تم کہوگے کہ جس وقت یہ تبدیلیاں پیدا ہوئی تھیں اُس وقت اخبار اور ٹیلی ویژن تھے ہی نہیں۔ مگر یقین جانو آج بھی یہ تبدیلیاں اسی طرح ہوتی ہیں۔ مگر جس وقت یہ تبدیلی پیدا ہوتی ہے اس وقت یہ اِتنی چھوٹی یا معمولی سی ہوتی ہے کہ ہمیں پتہ ہی نہیں چل پاتا ــــ اور اِنہی چھوٹی چھوٹی تبدیلیوں سے ترقی کرتا ہوا انسان اب آج کی زندگی تک پہنچا ہے۔ اس کی جیب میں چند کاغذ کے پرزے پڑے رہتے ہیں اور وہ جہاں چاہے، جو کچھ چاہے، خرید سکتا ہے۔ صرف ایک کاغذ پر رقم لکھ کر اور دستخط کر کے دے دیتا ہے اور روپیے پیسے کی ادائیگی ہو جاتی ہے۔

میں نے سوچا کہ سائنسی ترقیوں کی گرما گرم خبریں تو تم اخباروں میں پڑھتے ہی رہتے ہو۔ میں تمھیں تمھاری ان سماجی اور معاشی ترقیوں کی کہانیاں سناؤں جن کی وجہ سے آج ہم اور تم 'تہذیب یافتہ انسان' کہلانے لگے ہیں ــــ گھر بیٹھے اپنے عزیزوں اور دوستوں کے خط پڑھ لیتے ہیں، بازاروں میں ہاتھ ہلاتے چلے جاتے ہیں، ہمارے سر پر ایک من اناج کی گٹھری نہیں ہوتی، ہمارے پیچھے بھیڑ بکریوں کا گلّا نہیں ہوتا، اور ہم اپنا من پسند سامان خرید لاتے ہیں۔

میری یہ کتاب 'بینک کی کہانی'، اِسی سلسلے کی تیسری کڑی ہے ــــ

پہلی 'پیسے کی کہانی' اور دوسری 'خط کی کہانی' تھی ——— اِس کتاب میں میں نے یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ ہماری روزانہ زندگی میں بینکوں کا کتنا بڑا حصّہ ہے ؟ ہم نے کیسے اور کب یہ اعتبار کرنا شروع کر دیا کہ ہم اپنے پیسوں کو دوسروں کے پاس جمع کرا دیں اور ان کے دیے ہوئے 'کاغذی وعدوں کو اپنی دولت سمجھتے رہیں ؟

میرے خیال میں تو یہ ایک دلچسپ کہانی بھی ہے اور انسان کے ذہن کی ترقّی کی ایک تصویر بھی ! مجھے خوشی ہوگی اگر تم اِسے پڑھو، سمجھو اور اِس کے کچھ بُنیادی اصول اپنے ذہن میں جمانے کی کوشش کرو ——— ممکن ہے یہ تمھاری آیندہ زندگی میں کچھ مدد بھی پہنچائیں۔

غُلام حیدر

پہلا باب

پیسہ۔ روپیہ۔ دولت

پیسہ ہی رنگ ، رُوپ ہے، پیسہ ہی مال ہے
پیسہ جو ہو تو دیو کی گردن کو باندھ لائے
پیسہ نہ ہو تو مکڑی کے جالے سے خوف کھائے
پیسے سے 'لالہ بھیّا جی' اور 'سیٹھ جی' کہائے
بِن پیسے ساہُوکار بھی ایک چور سا دِکھائے
پیسہ ہی رنگ ، رُوپ ہے، پیسہ ہی مال ہے
پیسہ نہ ہو تو آدمی چرخے کی مال ہے

یہ نظیر اکبرآبادی کی بڑی اچھی سی نظم کا ایک بند ہے۔ سُنا ہے کہ نظیر خود تو پیسے کو ہاتھ بھی نہ لگاتے تھے مگر اس کی اہمیت بلکہ طاقت کو خوب سمجھتے تھے۔ سچ ہے 'پیسے میں بڑی طاقت ہے ——!' مگر یہ طاقت آئی کہاں سے ؟ کس نے دی ؟ کب دی ؟ ایسے بہت سے سوال دماغ میں کبھی کبھی خود ہی پیدا ہونے لگتے ہیں۔

اور پھر اگر ہم پیسے کو کھا سکتے ، نوٹوں کے کپڑے بنا سکتے، ریزگاری سے مکان کھڑے کر سکتے تب بھی ایک بات تھی! مگر حالت یہ ہے کہ

اگر کوئی بچّہ کوئی سِکّہ نِگل جائے تو ڈاکٹر کے پاس دوڑنا پڑتا ہے، جیب میں اگر کوئی نوٹ پسینے یا بارش میں بھیگ جاتا ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے یہ دولت ہاتھوں سے نِکل جائے گی، تیز ہوا میں اُڑ جائے گی۔ مگر ساتھ ہی یہ بات بھی کچھ بہت غلط نہیں ہے —— 'بن پیسے ساہوکار بھی اِک چور سا دِکھائے'۔

ہاں بھائی ایک طرح یہ بات بھی سچ ہے کہ اُسی چیز کو جس کی اپنی کوئی اصلیت نہیں ہے، ہم لوگوں نے اپنی زندگی میں سب سے زیادہ اہمیت دے دی ہے۔ اور اب تو اِس 'مایا جال' یا پیسے کے چکّر میں کچھ ایسے پھنسے ہیں کہ جتنی رسّی بڑھتی جا رہی ہے اُس کے بَل بھی بڑھتے جا رہے ہیں۔

اِس 'مایا جال' یا 'ننانوے کے پھیر' میں صرف ایک ہی پھندا نہیں ہے —— پھندوں میں پھندے اور جال میں جال ہیں۔ مگر چونکہ یہ پھندے ہمارے اپنے یعنی خود انسان ہی کے لگائے ہوئے ہیں اِس لیے انھیں کھولا بھی آسانی سے جا سکتا ہے۔ اور پھر جب یہ گرہیں کھُلتی ہیں تو ہمیں انسان کے عجیب عجیب کام اور اس کی دماغی ترقّی اور اُٹھان کی کچھ دلچسپ تصویریں بھی نظر آتی ہیں۔

کئی ہزار سال پہلے کا انسان، جس کی ضرورتیں بھی بہت تھوڑی سی تھیں اور اُنھیں پُورا کرنے کا سامان بھی بس گِنا چُنا ہی تھا۔ اُسے پیسے کی ضرورت یا تو تھی ہی نہیں، یا اگر تھی بھی تو بہت تھوڑے موقعوں پر —— پھر اُس نے ترقّی کی، اُس کی ضرورتیں بھی بڑھیں اور اُن کو پُورا کرنے کے ذریعے اور سامان بھی۔ مشکلیں آئیں تو اُس نے حل نِکالے —— اور

پھر آج کی دُنیا، جس میں اَن گنت ضرورتیں ہیں اور اتنا ہی سامان ہے۔
آؤ ذرا اِن پھندوں میں سے کچھ پھندے کھولنے کی کوشش کریں۔
اب شاید سب سے پہلا سوالیہ نشان یا پھندا تو یہی ہوگا کہ پیسہ ہمارے پاس کہاں سے اور کیسے آنا شروع ہو گیا ؟

کہاں ؟ کب ؟ اور کیسے ؟

ویسے تو یہ خود ہی ایک کہانی ہے۔ کئی ہزار سال کی کہانی۔ (اسے میں اپنی ایک اور کتاب 'پیسے کی کہانی' میں پہلے بھی سُنا چکا ہوں) مگر یہاں تو ہم اِس کہانی پر یوں ہی ذرا سرسری سی نِگاہ ڈالیں گے۔
جب ہمارے بُزرگ جنگلوں میں رہتے تھے، اپنے اور اپنے گھر والوں کے لیے جانوروں کا شِکار کرتے تھے، یا جنگلی پھل توڑ کر کھا لیتے تھے تو انھیں روپے پیسے جیسی کسی چیز کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ یہ ضرورت تو اصل میں اُس وقت پیش آئی جب ان میں سے بہت سے لوگوں نے ایک جگہ رہنا شروع کیا، کھیتی باڑی شروع کی، کِسی نے مٹّی کے برتن اور پتھر کے اوزار، ہتھیار بنائے تو کِسی نے بھیڑیں بکریاں پالیں اور دودھ پیدا کرنا شروع کیا۔ اب جب پتھّر کے اوزار، ہتھیار بنانے والے کو اناج کی ضرورت پیش آتی تو وہ کسان سے اناج لے لیتا اور اُسے پتھّر کا بنا ہَل کا پھلکا اور ہتھوڑا دے دیتا۔ مگر تم خود ہی سوچ سکتے ہو کہ یہ چیز سے چیز بدلنے کا چکّر کتنا چھوٹا ہوتا ہوگا۔
اگر کِسی کے پاس اناج ہے اور اُسے دودھ کی ضرورت ہے تو اُسے ایک ایسا آدمی ڈھونڈنا ضروری تھا جس کے پاس دُودھ بھی ہو

اور وہ اُس کے بدلے میں صرف اناج ہی لینا چاہتا ہو۔ ممکن ہے اُسے کوئی ایسا شخص تو مل جائے جس کے پاس دُودھ ہو، مگر وہ دُودھ کو چربی سے بدلنا چاہتا ہو —— پھر اب کیا ہو؟ اس لیے جب تک زندگی گزارنے کے لیے تھوڑی سی چیزیں رہی ہوں گی کام چلتا رہا ہوگا۔ مگر جیسے ہی ایک طرف ضرورتیں اور دوسری طرف سامان بڑھا ہوگا لین دین کا یہ طریقہ مشکل بلکہ ناممکن سا ہوگیا ہوگا۔

اب اس پھندے کو کھولنے کے لیے انسان نے کچھ اس طرح کیا کہ دو چیزوں کے لین دین کے بیچ میں ایک تیسری چیز ڈال لی۔ یعنی پتّھر کے اوزار ہتھیاروں کو پہلے بھیڑوں یا بکریوں سے بدل لیا اور پھر بھیڑ بکریوں کو اناج سے، یا جس چیز کی اُسے ضرورت ہوئی اُس سے بدل لیا —— بالکل اسی طرح جیسے آج ایک کارخانے دار اپنے کارخانے میں پیدا کی ہوئی چیزوں کو روپے پیسے سے بدل لیتا ہے اور پھر روپے پیسوں کو اپنی ضرورت کی چیزوں سے بدل لیتا ہے —— آٹا، دال، جُوتے، کپڑے وغیرہ خرید لیتا ہے۔

لیجیے صاحب! اب سے نہ جانے کتنے ہزار سال پہلے یہ پہلا چکّر شروع ہوا۔ مگر اُس وقت یہ گرہ بہت آسان تھی، بلکہ یوں کہیں کہ اِس پھندے کے صرف دو سرے تھے۔ اور وقت کے ساتھ ساتھ اور دُنیا کے مختلف ملکوں میں کبھی اناج، کبھی کھیتی باڑی کے اوزار —— یعنی کُھرپے پھاوڑے —— کبھی گھر کے برتن، کبھی سیپ، کوڑی اور ہاتھی دانت، کہیں نمک، کہیں تیل اور گھریلو استعمال کی نہ معلوم کیا کیا چیزیں —— ہمارے آج کے پیسے کی جگہ استعمال ہوتی رہیں۔

بس شروع میں یہ ضرور خیال رکھا جاتا تھا کہ جو چیز بھی اِس لین دینا کے بیچ میں ڈالی جاتے وہ خود بھی انسان کے کام کی چیز ہو۔ اب چاہے اُس سے کوئی اور چیز بدل لیجیے چاہے اسی کو استعمال کریجیے ـــــ جیسے بھیڑیں بکریاں، تیل، نمک وغیرہ۔ اور آہستہ آہستہ یہ کہانی، یعنی انسان کی ترقی کی کہانی یہاں تک پہنچ گئی کہ اُس نے دھات کو نہ صرف استعمال کرنا شروع کر دیا بلکہ یہ اُس کے لیے شاید سب سے ضروری چیزوں میں سے ایک چیز بن گئی۔ دھات کو لین دین کے بیچ میں ڈال لینے میں بڑی آسانی تھی۔ اِس کا بڑے سے بڑا یا چھوٹے سے چھوٹا ٹکڑا کاٹا جا سکتا تھا۔ یہ گل سڑ کر خراب بھی نہیں ہوتی تھی اور کام کی چیز بھی تھی۔

جب تم لوگ بڑے ہو کر آگے پڑھوگے تو تمھیں روپے پیسے کے تین سب سے بڑے گُن نظر آئیں گے۔

1۔ یہ لین دین کو آسان کر دیتا ہے۔ اِسے ہم لین دین کا ذریعہ یا انگریزی میں (Medium of Exchange) کہتے ہیں۔

۲۔ اِس کے ذریعے مال و دولت کو جمع کیا جا سکتا ہے۔ اِسے ہم انگریزی میں (Store of Value) کی خصوصیت کہتے ہیں۔

3۔ اِس کے ذریعے کسی چیز کی قدر یا قیمت کو ناپا جا سکتا ہے۔ جیسے آج ہم کہتے ہیں کہ 80 صفحوں کی ایک کاپی پچاس پیسے کی اور ایک پنسل 30 پیسے کی ہے۔ اِسے انگریزی میں (Measure of Value) کی خصوصیت کہتے ہیں۔

یہ خصوصیتیں شاید دھاتوں سے اچھی کسی اور چیز میں نہیں ہوتیں۔ اِس لیے جس دن سے لوگوں نے دھات کو دو چیزوں کے لین دین کے بیچ میں

ڈالنا شروع کیا، دھات ہماری دولت یا روپے پیسے سے کچھ ایسی چپک سی گئی کہ آج تک ہماری دولت اِس سے پُوری طرح آزاد نہ ہو سکی۔

دھات کے سِکّوں کی عُمر اب لگ بھگ ڈھائی تین ہزار سال کی ہوگئی ہے اور حالانکہ اب دُنیا بھر میں کاغذ آہستہ آہستہ اس کی جگہ لیتا جا رہا ہے، بلکہ کچھ عالموں کا خیال تو یہ ہے کہ دُنیا میں نوّے فیصدی کاروبار یا لین دین اب کاغذ کے ذریعے ہی ہوتا ہے، پھر بھی دولت یا روپے پیسے سے دھات کو بالکل الگ ہی کر دیا جائے، یہ کام نہ معلوم کبھی ہو بھی پائے گا یا نہیں، یہ نہیں کہا جا سکتا۔

روپے پیسے کے معاملے میں اعتبار اور یقین ہی سب سے بڑی چیز ہے۔ حالانکہ آدمی اپنی دولت کے معاملے میں بڑی مشکل سے ہی کسی پر اعتبار کرتا ہے، مگر تم آگے چل کر دیکھو گے کہ اسے اعتبار کرنا ہی پڑتا ہے۔ اگر اعتبار نہ کرے تو دُنیا کے سارے کاروبار ٹھپ ہو کر رہ جائیں۔

تو اب ہم نے تھوڑا سا یہ پھندا تو کھول لیا کہ یہ پیسہ کب، کہاں سے اور کیسے ہمارے ساتھ آ گیا۔ مگر ابھی تک ہم یہیں پہنچ سکے ہیں کہ آج سے کوئی ڈھائی تین ہزار سال پہلے لوگوں نے دھات کے روپے پیسے استعمال کرنے شروع کر دیے۔ مگر اس کے بعد ایک اور گرہ فوراً ہی نظر آتی ہے۔ وہ یہ کہ اب تو دھات بھی نہیں کاغذ کے چھپے ہوئے ٹکڑوں ہی سے کام چل جاتا ہے۔ سونا چاندی وغیرہ تو خیر قیمتی دھاتیں تھیں۔ لوگ ان ہی کو اپنی دولت سمجھتے تھے۔ اگر ان کے سِکّے بھی ڈھال لیے یا کُوٹ پیس کر انھیں گول یا چوکور کر لیا تو کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔ مگر یہ کاغذ ——! جس پر 'دس روپے' یا 'سَو روپے' کے لفظ چھپے ہوتے ہیں، یہ تو اپنے طور پر کسی کام

کا بھی نہیں ہوتا۔ اِس سے تو کوئی پڑیا بھی صحیح طرح سے نہیں باندھی جاسکتی۔

روپے پیسے یا دولت کے لیے ہمارے، یعنی انسانوں کے سوچنے سمجھنے کے ڈھنگ کے سلسلے میں کچھ لوگوں کا خیال یہ ہے کہ انسان نے سب سے پہلے بالکل اصلی چیزوں — جیسے بھیڑ، بکری، اناج، گھریلو سامان، برتن، کُھرپے، پھاوڑے، چاقو وغیرہ — کو اپنا 'روپیہ پیسہ' بنایا اور پھر ان سے سجاوٹ کی چیزوں کی طرف بڑھ گیا جن میں سیپ، کوڑی، ہاتھی دانت، سونا، چاندی وغیرہ جیسی چیزیں آجاتی ہیں۔ اور اب آج کے زمانے میں اِس کا جُھکاؤ اُدھار کی طرف ہے، جس کی مثال نوٹ، چیک اور ایسے ہی وعدوں کے کاغذ ہیں جن کی اپنی کوئی قیمت نہیں ہے، صرف ان پر لکھے ہوئے لفظوں کی قیمت ہے۔ ہمیں اِس مضمون میں ایک خاص اور بڑا پھندا یہ بھی کھولنا ہے کہ ہم نے کاغذ پر اِتنا اعتبار کب سے کرنا شروع کر دیا۔

قیمتی سِکّوں سے کاغذ تک — پہلا دَور

اب سے کچھ عرصے پہلے تک روپیہ، پیسہ یا دُنیا کا کوئی بھی سِکّہ بناتے وقت ایک خاص بات کا خیال رکھا جاتا تھا، وہ یہ کہ کوئی سِکّہ جتنی قیمت میں بھی بازار میں چلتا ہو اُس میں لگ بھگ اُسی قیمت کی دھات لگی ہو — نہ زیادہ نہ کم۔

مگر ایسا بھی نہیں تھا کہ پہلے لوگوں کی سمجھ میں یہ بات بالکل آئی ہی نہ ہو کہ پیسے یا کِسی سِکّے کا کام صرف اِتنا ہے کہ وہ دو چیزوں کے لین دین کو آسان کر دے — چاہے وہ کِسی قیمتی دھات کا ہو، یا گھٹیا دھات کا'

یعنی تانبے، پیتل یا ٹین کا ہو، یا پھر کاغذ ہی کا کیوں نہ ہو۔

خود ہندوستان ہی میں محمد بن تغلق نے، جو یہاں 1325 سے 1351 تک حکومت کرتا تھا، ایک ایسی ہی کوشش کی تھی۔ اُس نے سونے کے بجائے تانبے کے 'سکّے' چلائے تھے، جو بازار میں سامان اتنا ہی خریدتے تھے جتنے سونے کے سکّے خریدتے تھے۔

ایک منگول نسل کے بادشاہ قبلائی خان نے جو 1259 سے 1294 تک چین کے بہت بڑے مُلک پر حکومت کرتا تھا، کاغذی سکّے، یعنی نوٹ چلائے تھے۔ یہ اُس کے زمانے تک خوب چلتے رہے۔ جب کسی کو سونے چاندی کی ضرورت ہوتی تو وہ ان کاغذی سکّوں سے، خزانے سے سونا چاندی بدل لاتا۔

اگر سچ پُوچھو تو چین تو اِس معاملے میں دُنیا کے اور مُلکوں سے بہت ہی آگے رہا ہے۔ لگ بھگ دوسری صدی عیسوی ہی میں چین نے آج کے کاغذ سے مِلتا جُلتا کاغذ بنا لیا تھا۔ اور کہا جاتا ہے کہ وہاں کے 'تانگ' خاندان کے بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ نے جو 650 سے 656 تک حکومت کرتا تھا، کاغذ کے نوٹ چلائے تھے۔ یہ نوٹ تو اب موجود نہیں ہیں لیکن ان کی تصویر چین کی ایک پُرانی تاریخ میں مِل جاتی ہے۔

ایران میں بھی منگول نسل کے ہی ایک بادشاہ کیخاتو خان نے، قبلائی خان سے کچھ ہی دن بعد کاغذ کے نوٹ چلانے کی کوشش کی۔ ایک بہت بڑے سیّاح ابنِ بطوطہ نے یمن کی ایک ریاست 'کلوا' کے متعلق لِکھا ہے کہ یہاں ٹین کے سِکّے چلتے تھے۔

لیکن ساتھ ہی تاریخ
یہ بھی بتاتی ہے کہ اِس
قِسم کے سارے سِکّے زیادہ
سے زیادہ اُسی وقت تک
چلے جب تک اُس بادشاہ
کی یا اس کے خاندان کی
حکومت رہی۔ اُس کے
بعد تو پھر پانچ چھ سَو
سال تک ساری دُنیا میں
وہی سونے چاندی یا
تانبے پیتل کے سِکّے چلے،
اور ان کا اصول وہی تھا
کہ ان میں اُتنی ہی قیمت
کی دھات لگائی جائے
جتنی قیمت میں کوئی سِکّہ
بازار میں چلتا ہو۔
اب ممکن ہے تم
پُوچھو کہ جب ایک بار ایک
صحیح بات انسان کی سمجھ
میں آگئی تھی تو پھر اُس نے
اُسے چھوڑ کیوں دیا؟

تصویر ع[1] :۔
"تانگ" خاندان کا چلایا ہوا دُنیا کا شاید سب سے پُرانا
کاغذی سِکّہ یا "نوٹ"۔
650 اور 656 کے درمیان جاری کیا گیا۔ (نقل)
یہ نوٹ 9 انچ لمبا اور تقریباً 6 انچ چوڑا تھا۔
(اسٹوری آف پیپر منی (Story of Paper Money
سے شکریہ کے ساتھ اخذ کی گئی)

تصویر 2
شہنشاہ یوان شی سو کے 1263 کے 'نوٹ' کی تصویر۔
اسٹوری آف پیپر منی (Story of Paper Money)
سے شکریے کے ساتھ اخذ کی گئی۔

ٹھیک ہے بھائی، بات تو کچھ لوگوں کی سمجھ میں ضرور آگئی تھی مگر اس کا اصول یا اس کی بُنیاد ابھی پکّی نہیں ہوئی تھی۔ اور عام آدمی اُس وقت تک کسی چیز کو نہیں اپناتا جب تک اُس کا اصول اُس کی سمجھ میں نہیں آجاتا۔ اِسے دوسرے لفظوں میں یوں بھی کہہ سکتے ہو کہ روپے پیسے کے معاملے میں اعتبار ہی سب سے بڑی چیز ہے ۔جب تک انسان کو دھات پر اعتبار نہیں پیدا ہوا تھا اُس نے اسے بھی اپنی دولت کے رُوپ میں نہیں اپنایا تھا —— ہم تو آج بھی سِکّے کو اچھی طرح ٹھوک بجا کر دیکھنے کے عادی ہیں —— اِسی طرح اُسے جب تک پُورا یقین اور بھروسہ نہیں ہوگیا وہ اِس بات کے لیے بھی تیّار نہیں ہوا کہ اپنی دولت کو صرف معمولی کاغذ کی شکل میں دیکھے —— تو پھر اب ہمیں یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ کاغذ پر یہ اصلی عتبار کب سے پیدا ہونا شروع ہوا۔
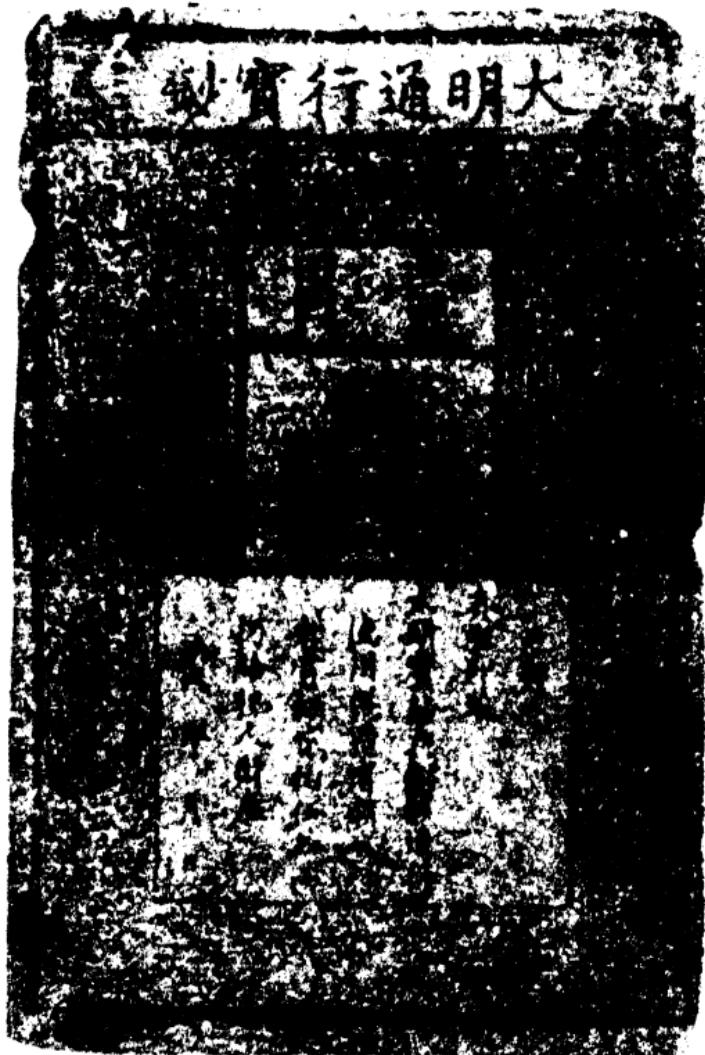
تصویر 3 :۔ 'منگ' خاندان کے شہنشاہ ٹی اینتو ہنگ وُو، کا 1368 کا نوٹ۔ یہ نوٹ 13 انچ لمبا اور 8 انچ چوڑا تھا اور اب تک جاری ہونے والا سب سے بڑا نوٹ مانا جاتا ہے۔
(انسٹی ٹیوٹ آف بینکرس، لندن کے شکریے کے ساتھ)

دولت کی حفاظت

اور بھائی اب جب پیسے کو 'رنگ ، رُوپ' اور اسی کو 'مال' مانا جاتا ہے اور اس کے بغیر آدمی کو 'چرخے کی مال' کہا جاتا ہے تو انسان اِس کی حفاظت بھی خوب کرتا ہے ۔ اور آج ہی نہیں کرتا ، شروع سے کرتا چلا آیا ہے ۔ پیسے اور دولت کو محفوظ رکھنے کے لیے اس نے ہمیشہ عجیب عجیب جتن کیے ہیں ۔ کبھی گھڑوں ، مٹّی کی ہانڈیوں اور پیتل کے کلسوں میں بند کر کے اسے زمین میں گاڑ دیا ہے —— چنانچہ آج بھی کبھی کبھی سُننے میں آجاتا ہے یا اخباروں میں ایسی خبریں پڑھنے کو مل جاتی ہیں کہ پُرانے سِکّے یا سونا چاندی زمین میں دبے ہوئے مِلے ہیں ۔ کتنے ہی ایسے قصّے کہانیاں بُزرگوں سے سُننے کو مِل جاتی ہیں ۔ کبھی اسے دیواروں اور گھر کی بُنیادوں میں رکھ دیا گیا ، کبھی گھروں میں تہہ خانے ، چور کوٹھریاں ، طاقوں میں طاق اور کوٹھریاں بنوائی گئیں ۔ پھر جب انسان نے اور ترقّی کر لی تو مضبوط مضبوط تجوریاں اور دھوکا دینے والے تالے بنوائے اور نہ معلوم کیا کیا ترکیبیں ہمیشہ سے دولت کی حفاظت کے سلسلے میں ایجاد کی جاتی رہی ہیں ۔

پھر جس کے پاس جتنا پیسہ ہوگا اُتنا ہی اُسے خرچ کرنے کے لیے بار بار اس کی ضرورت بھی پیش آئے گی —— سفر پر جائے گا تو ساتھ لے جانا بھی پڑے گا ، بیوپار کے لیے سامان خریدے گا تو سامان کی قیمت چُکانے کے لیے بھی ضرورت پڑے گی ۔ اب ایک طرف تو پیسے کو ساتھ رکھنے کی ضرورت اور دوسری طرف اُس کے کھو جانے یا چوری ہو جانے کا ڈر ——

بس انسان کی اِسی ضرورت یا مجبوری نے اُسے بہت سی باتیں سوچنے پر مجبور کیا ــــ کچھ ایسی ترکیبیں جیسے تجارت کا سامان اُسے مِل جائے اور اُس کی قیمت کی ادائیگی بعد میں اور ایک ساتھ ہی ہو جائے تاکہ بار بار روپیہ لیے پھرنے کے بجائے ایک ہی بار میں احتیاط سے پہنچا دیا جائے۔ کبھی ایسا بھی کیا کہ کسی بیوپاری نے دوسرے شہر کے کسی تاجر سے سامان خریدا اور اس کی قیمت ادا کرنے کے بجائے اُس سے کہہ دیا یا لِکھ کر وعدہ کر لیا کہ وہ اُس کے شہر میں آکر سامان خرید لے، اس سامان کی قیمت وہاں ادا کر دی جائے گی۔

کبھی کبھی اسی حفاظت کے خیال سے کچھ ایسے لوگ جن کے پاس تھوڑی بہت دولت جمع ہوتی تھی، اپنا پیسہ گاؤں یا شہر کے کسی نیک آدمی کے پاس امانت کے طور پر رکھوا دیتے تھے۔ مندر کے پُجاریوں کو نیک سمجھ کر اور اِس خیال سے کہ ممکن ہے چور یہاں آکر چوری کرنے سے ڈریں، اپنی دولت یہاں بھی رکھوا دیتے تھے۔ چنانچہ حضرتِ عیسیٰ سے لگ بھگ دو ہزار برس پہلے 'بابُل' اور مِصر کی عبادت گاہوں میں لوگ روپیہ جمع بھی کرواتے تھے اور کبھی کبھی ضرورت پڑنے پر اُدھار بھی لے لیتے تھے۔

مِصر کے کچھ مندروں کی کُھدائی میں نِکلے ہوئے پتھروں پر کچھ ایسی عبارتیں بھی کُھدی ہوئی مِلی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں سونا چاندی اور اناج جمع بھی رکھا جاتا تھا اور اُدھار بھی دیا جاتا تھا۔

پھر کچھ دن بعد یونان کے کچھ مندروں میں بھی ایسا ہی کام ہوا۔ بلکہ یونان اور روم کے بڑے بڑے شہروں میں تو باقاعدہ قسم کے کچھ اِدارے، یا جنھیں کمپنیاں بھی کہا جا سکتا ہے، ایسے تھے جن کا کاروبار ہی روپیہ پیسہ

جمع رکھنا اور اُدھار دینا تھا۔

رہی اُدھار کی بات — تو ویسے عام آدمی کی زندگی میں ہی کتنے ایسے وقت آتے ہیں جب اُسے اُدھار لینے کی ضرورت پیش آجاتی ہے۔ ممکن ہے تمھیں یہ جان کر کچھ حیرت بھی ہو کہ اُدھار لینے کی سب سے زیادہ ضرورت بیوپاریوں اور بڑے بڑے کارخانوں کے مالکوں کو ہی پیش آتی ہے۔ خیر عام آدمی کی چھوٹی موٹی ضرورتوں کے لیے تو اُدھار دوستوں، ساتھیوں وغیرہ سے ہی مل جاتا ہے، چونکہ یہ معمولی یا چھوٹا سا اُدھار ہوتا ہے، لیکن یہ بڑے بڑے تاجر اور کارخانے دار، جن کا مطلب ہوا دولتمند، اِن کی اُدھار کی ضرورتوں کو کون پُورا کرے؟ اِنھیں تو اُدھار بھی ہزاروں اور کبھی کبھی لاکھوں بلکہ کروڑوں روپیوں میں چاہیے ہوتا ہے۔

بس اِن دونوں ضرورتوں — یعنی اپنی دولت کی حفاظت اور دوسری طرف وقت پڑنے پر اُدھار مل جانے کی آسانی، انھوں نے آہستہ آہستہ ایک ایسی چیز کو جنم دیا جسے تم دولت کا گھر بھی کہہ سکتے ہو، دولت پیدا کرنے کی مشین کہہ سکتے ہو، دولت کے کھیت کا نام بھی دے سکتے ہو، سونے کا انڈا دینے والی مُرغی کہہ سکتے ہو یا جو چاہو نام دے سکتے ہو۔ ویسے آج کل اِسے 'بینک' کہتے ہیں۔

سچ بات تو یہ ہے کہ جب سے بینک کا نام یا اِس کا کام دُنیا میں شروع ہوا بس یوں سمجھو کہ دُنیا کی دولت کے سلسلے میں انسان کا تصوّر یا اُس کے سوچنے سمجھنے کا ڈھنگ ہی بدل گیا۔ روپے پیسوں نے اپنی شکلیں بدل لیں۔ اور یہی وہ چیز بھی تھی جس نے ہمارے روپے سے سونے چاندی کا لباس لے کر کاغذ کا لباس دے دیا۔ اور اب اگر سچ پُوچھو تو دُنیا کا کاروبار،

بیوپار ، لین دین ، جمع پونجی ، قرض اُدھار ، سب کچھ اِسی بینک سے ہوتا ہے۔

اب دیکھو! ہم چلے تو تھے اس سِرے سے کہ سونے چاندی کے سِکّے کاغذ کے نوٹ کیسے بن گئے ، اور پہنچے اس سِرے پر کہ پہلے روپے پیسے کے گھریا 'بینک' کی گرہ کھول لیں تب معلوم ہوگا کہ کاغذ کے نوٹ کہاں سے آگئے۔ اور میں نے تو پہلے ہی تم سے کہا تھا کہ یہ پھندا یا اُلجھنا ایسا ہے کہ اس میں پھندے میں پھندا اور گرہ میں گرہ نظر آتی ہے۔ مگر اچھا یہ ہے کہ یہ سب گرہیں کُھل جاتی ہیں۔

پیسہ پیسے کو کھینچتا ہے

یہ ایک بڑی پُرانی کہاوت ہے کہ 'پیسہ پیسے کو کھینچتا ہے'۔

سُنا ہے ایک غریب آدمی تھا۔ اُس نے جب یہ کہاوت سُنی تو اُس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ اُس نے یہ تو ضرور سُنا تھا کہ 'پیسہ گول ہوتا ہے اِس لیے جلدی ہی ہاتھ سے لُڑھک جاتا ہے ، یا چپٹا ہوتا ہے اِس لیے ایک پر ایک رکھ کر جمع کیا جا سکتا ہے ، مگر یہ کبھی نہیں دیکھا تھا کہ کِسی پیسے نے کِسی دوسرے پیسے کو کھینچ لیا ہو۔

اُس نے ایک مہاجن سے کہا کہ تمھارے پاس تو بہت سے روپیے ہوں گے ، تم ہی مجھے دِکھلا دو کہ پیسہ پیسے کو کیسے کھینچ لیتا ہے؟' مہاجن تیّار ہوگیا اور اُس نے غریب آدمی سے کہا کہ وہ ایک چاندی کا روپیہ لے آئے تو وہ اُسے یہ تماشہ دِکھلا دے گا۔ اب بیچارے غریب آدمی نے ایک ایک دو دو پیسے جمع کر کے چاندی کا ایک روپیہ حاصل کیا اور مہاجن کے

پاس پہنچ گیا ۔ مہاجن اُسے اپنے اُس کمرے میں لے گیا جہاں اُس کے بہت سے روپیوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا ۔ مہاجن نے اُس آدمی سے کہا کہ وہ اپنا روپیہ چٹکی میں پکڑ کر کھڑا ہو جائے ۔ مہاجن خود بھی وہیں بیٹھ کر اپنے بہی کھاتے میں حساب کتاب لکھنے لگا ۔

ایک گھنٹہ بیتا ، دو گھنٹے بیتے ۔ شروع شروع میں تو غریب آدمی بہت خوش تھا اور دل ہی دل میں دعائیں کر رہا تھا کہ آج بہت سے روپیے کھنچ آئیں تو اُس کی بہت سی پریشانیاں دُور ہو جائیں —— چونکہ یہ پہلے ہی طے ہو گیا تھا کہ جو روپیہ بھی کھنچا وہ اس کا ہوگا ۔

شاید تھکن کی وجہ سے وہ اُونگھ گیا اور اُس کا روپیہ اُس کی چٹکی سے نکل کر لڑھکتا ہوا مہاجن کے بہت سے روپیوں کے ڈھیر میں جا ملا ۔ وہ چونک پڑا اور جھپٹا کہ اپنا روپیہ اُس ڈھیر میں سے نکال لے ۔ مگر مہاجن نے اُسے فوراً روک دیا —— اب بھائی اصول کے اعتبار سے تو مہاجن کا یہ کہنا بھی ٹھیک ہی تھا کہ ' زیادہ چیز نے تھوڑی چیز کو کھینچ لیا ، تم نے خود ہی دیکھا ہوگا کہ اگر بڑے سے لوہے کے ٹکڑے کے پاس چھوٹا سا مقناطیس کا ٹکڑا لے جاؤ تو لوہے کی بجائے مقناطیس ہی کھنچ کر لوہے سے چپک جاتا ہے ۔

خیر بھائی ، یہ تو تھی کہانی یا ایک لطیفہ ، مگر باتیں یہ دونوں ہی سچ ہیں کہ پیسہ پیسے کو کھینچتا بھی ہے ، اور بہت سا پیسہ تھوڑے سے پیسے کو کھینچ لیتا ہے ۔ اِسے آج کی زندگی میں تو تم اِسی طرح دیکھ سکتے ہو کہ بڑا بیوپاری جو بہت زیادہ روپیے اپنے کاروبار میں لگاتا ہے منافع بھی بہت زیادہ کماتا ہے ، اور چھوٹا بیوپاری یا کارخانے دار کم منافع کماتا ہے ،

اسی لیے کہ اُس کے پاس تھوڑا روپیہ ہوتا ہے۔

اچھا تو اب ذرا یہ دیکھیں کہ روپے پیسے میں یہ دوسرے روپے پیسوں کو کھینچ لینے کی طاقت کیسے اور کب پیدا ہوئی اور اس نے کون کون سی نئی باتیں پیدا کیں۔

وقت کی سڑک پر ایک بار پھر ذرا سا پیچھے ہٹ کر اُسی سرے سے چلیں کہ بڑے بڑے بیوپاری اپنا روپیہ کسی محفوظ جگہ رکھوانا چاہتے تھے تاکہ اُسے چور ڈاکو نہ لے جائیں۔ مگر انھیں اپنے کاروبار کی ضرورتوں کو پُورا کرنے کے لیے بار بار تھوڑے بہت روپے کی ضرورت بھی پیش آتی تھی۔ پھر وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ یا تو انھیں روپیہ لے کر چلنا ہی نہ پڑے یا اگر لے بھی جائیں تو کچھ تھوڑا سا۔ اصل میں چور ڈاکوؤں کا مسئلہ تو الگ رہا ایک مسئلہ خود روپیے کے بوجھ کا بھی تھا۔

تم اس پریشانی کو آج اِس لیے محسوس نہیں کر سکتے کہ اپنی جیبوں میں ہلکے پھُلکے نوٹ ڈالے پھرتے ہو۔ ذرا غور کرو کہ کسی بیوپاری کو صرف سَو میل دُور کسی پڑوس کے شہر میں صرف پانچ ہزار روپیے ادا کرنے ہیں —— جو بیوپار میں بہت تھوڑی رقم ہوتی ہے۔ اور پھر یہ بھی ذہن میں رکھنا کہ اُس وقت ریلیں اور موٹریں نہیں چل رہی تھیں، صرف گھوڑے یا گھوڑا گاڑی پر ہی سفر ہوتا تھا۔ پہلے عام طور پر ایک تولہ وزن کا روپیہ ہوتا تھا، اور اسّی تولے کا ایک سیر (ایک کلوگرام سے کچھ ہی کم) اب یہ پانچ ہزار روپیے کا وزن ہوا ۶۲½ سیر، یا ایک من ساڑھے بائیس سیر —— سمجھے! اب تم خود بتاؤ کہ صرف پانچ ہزار روپیے ادا کرنے کے لیے اِتنا بہت سا بوجھ اُٹھا کر چلنے میں کتنی پریشانی اُٹھانی پڑتی ہوگی۔ اِسی لیے یہ لوگ چاہتے

تھے کہ کوئی ایسا طریقہ نکل آئے جس میں اُنھیں یہ بوجھ اُٹھائے اُٹھائے نہ پھرنا
پڑے اور ان کا روپیہ اپنے شہر میں بھی محفوظ رہے اور کسی دوسرے شہر
میں ادائیگی بھی ہو جائے۔

دوسرا باب

بینک کا پُرانا کاروبار

ہمارے مُلک میں دولت کا کاروبار

دُنیا کے سب سے پہلے بینکوں کا ذکر تو تم نے سُن ہی لیا —— یعنی مندر اور عبادت گاہیں ۔ لیکن اُنھیں آج جیسا بینک کہنا شاید صحیح نہیں ہوگا. اصل میں چونکہ اِنھیں کوئی اور نام نہیں دیا جا سکتا اِس لیے مجبوری میں ہم نے اِنھیں بینک کہہ دیا ہے ۔

پھر ان مندروں اور عبادت گاہوں کے بعد مہاجنوں ، صرّافوں، سُناروں ، سیٹھوں اور بنیوں وغیرہ کا نام آتا ہے ، جو نہ معلوم کب سے روپیے کے لین دین کا کام کرتے چلے آرہے ہیں اور آج تک بھی ان کا یہ کام کِسی نہ کِسی رُوپ میں چلا ہی آرہا ہے ۔

ہندوستان کی سب سے پُرانی اور مقدّس کتاب 'ویدوں' میں اُدھار (ऋण) کا ذِکر مِل جاتا ہے ، حالانکہ یہ بات صاف نہیں ہوتی کہ اُس وقت سُود لیا جاتا تھا یا نہیں ، اور اگر لیا جاتا تھا تو کِس حساب سے ؟ لیکن ان کتابوں کے کوئی ہزار ڈیڑھ ہزار سال بعد ، یعنی حضرتِ عیسیٰ سے کوئی پانچ چھ

سَو سال پہلے جو کتابیں لِکھی گئیں اُن میں قرض، اُدھار اور اس پر سُود کی شرح کا حساب بالکل صاف ہو گیا۔

تم نے 'جاتک کہانیوں' کا نام سُنا ہے؟ یہ مہاتما گوتم بُدھ کی پیدائش اور اُن کی زندگی سے متعلّق بہت سی کہانیاں ہیں۔ اُن کی مذہبی اہمیت کے علاوہ اُن میں ایک اچھّی بات یہ بھی ہے کہ اِن سے اُس زمانے کے عام لوگوں کی زندگی، رہن سہن، رسم و رواج وغیرہ کا بہت اچھّی طرح پتہ چلتا ہے۔ یہ کہانیاں لگ بھگ چھٹی اور پانچویں صدی قبلِ مسیح میں لِکھی گئی تھیں۔ ان کہانیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ روپیے کے لین دین کا بیوپار اُس زمانے میں ایک اچھا اور شریفانہ پیشہ سمجھا جاتا تھا۔ جو لوگ یہ کاروبار کرتے تھے اُنھیں عزّت کی نِگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور سیٹھ کہا جاتا تھا ـــــ 'سیٹھ' لفظ کے متعلّق خیال ہے کہ یہ سنسکرت کے 'شریشٹھ' (श्रेष्ठ) لفظ کی کچھ بِگڑی ہوئی شکل ہے۔ سنسکرت میں اِس کے معنی 'بہترین' یا 'سب سے اچھا' ہوتے ہیں۔

ویسے یہ بھی دلچسپ بات ہے کہ سنسکرت زبان نے اِس کام کے کرنے والوں کو جِتنے نام بھی دیے وہ عزّت کے ہی نام تھے۔ جیسے 'مہاجن' ـــــ 'مہا' معنی 'بڑا' اور 'جن' معنی 'آدمی'۔

اِنہی 'جاتک کہانیوں' سے پتہ چلتا ہے کہ اُس زمانے میں قانونی طور پر سُود کی شرح سَو روپیے پر پندرہ روپیے سال تھی۔

پھر اُس کے بعد دوسری اور تیسری صدی عیسوی میں 'منو' جو ہندو مذہب کے ایک بہت بڑے عالم تھے، اُنھوں نے ہندو مذہب کے قانونوں کی ایک کتاب 'سمرتی' لِکھی ہے۔ اُنھوں نے اپنی کتاب میں صرف اُدھار کا ہی ذِکر نہیں کیا بلکہ کِسی کے پاس روپیہ جمع رکھوانے کے اصول بھی لِکھے ہیں۔ یہ

بات بہت بڑی ہے۔ اصل میں مہاجن یا روپیے کے بیوپاری اور ایک بینک میں سب سے بڑا فرق ہی یہ ہے کہ مہاجن تو صرف اُدھار دیتا ہے اور اس پر سُود لیتا ہے لیکن بینک لوگوں کا روپیہ جمع بھی رکھتا ہے۔ کچھ اور آگے چل کر تم دیکھوگے کہ 'اُدھار' اور 'روپیہ جمع رکھنے' ان دونوں چیزوں مے سے جو صورت پیدا ہوئی اُسی نے روپیے کے لین دین اور دُنیا کے کاروبار میں بہت بڑا فرق پیدا کر دیا۔

ہاں تو ذکر تھا منو کا جنھوں نے روپیہ جمع رکھنے والوں کو اپنی کتاب میں سمجھایا تھا کہ :

"ایک سمجھ دار آدمی کو اپنا روپیہ ایک (اچھے) خاندان کے کسی شخص کے پاس جمع کرانا چاہیے۔ کوئی ایسا شخص جس کا چال چلن اچھا ہو، قانون کو بہت اچھی طرح جانتا اور سمجھتا ہو، ایمان دار ہو، اس کے بہت سے عزیز اور رشتہ دار ہوں، دولت مند اور عزت والا (آریہ) ہو۔"

اِس بات سے کم سے کم یہ اندازہ تو لگایا ہی جا سکتا ہے کہ لوگ اپنا روپیہ دوسروں کے پاس جمع کروا دیتے تھے۔ مگر اب بھی یہ پتہ نہیں چل پاتا کہ جمع کرانے والے کو کچھ سُود بھی مِلتا تھا یا نہیں۔

پھر ہمارے مُلک کے کچھ بڑے بڑے شہروں میں، اور آس پڑوس کے کئی گاوؤں سے مِل کر بنے ایک علاقے میں، ایک سا پیشہ رکھنے والے لوگوں کی کچھ انجمنیں بھی ہوتی تھیں —— جیسے سُناروں کی انجمن، لوہاروں کی انجمن وغیرہ۔ انھیں انگریزی میں گِلڈ (Guild) کہتے ہیں۔ ان میں سے کچھ انجمنوں نے بھی اپنے ممبروں کے لیے کچھ ایسا ہی کام کیا جیسا آج کل کے

بینک کرتے ہیں۔ یعنی یہ انجمنیں اپنے ممبروں کا روپیہ جمع بھی رکھتی تھیں اور ضرورت پڑنے پر اُنھیں اُدھار بھی دے دیتی تھیں۔ مگر اِس قسم کے اِداروں کا بھی مکمّل اور پُوری تفصیل سے حال نہیں مِل پاتا۔

سچّی بات تو یہ ہے کہ روپیے کے لین دین اور اُدھار دینے اور جمع رکھنے کا رواج تو بہت پُرانے زمانے سے ہی چلا آرہا ہے، مگر بس یہ کاروبار دو شخصوں کے بیچ میں ہی ہوتا تھا۔ اس نے ہمارے مُلک کی عام آبادی پر کوئی خاص اثر نہیں ڈالا، بلکہ اگر سچ پُوچھو تو ان مہاجنوں اور سُود خوروں نے عام آدمی کا بُری طرح خون چُوسا۔ جو بھی اُن کے چُنگل میں پھنسا اس کی اولاد بھی کبھی اس سے نہ نکل سکی —— خیر بھائی یہ ایک الگ قِصّہ ہے۔ ہمیں تو اِس وقت یہ دیکھنا ہے کہ یہ آج کے بینک کہاں سے آئے اور ان کا ہماری زندگی پر کتنا اثر پڑا۔

گیارھویں بارھویں صدی کے بعد سے ہندوستان میں کچھ بڑے بڑے مہاجنوں کے نام ایک بار پھر نظر آنے لگتے ہیں۔ ان میں جینی اور مُلتانی سیٹھ ساہوکاروں کے نام بہت مشہور ہیں۔ یہ اِتنے بڑے بڑے سیٹھ اور ساہوکار تھے کہ کبھی کبھی تو بادشاہوں کو حکومت کا کام چلانے کے لیے بھی اُدھار دے دیتے تھے۔ شیر شاہ سُوری کے زمانے میں دِلی سے کوئی ایک سو اسّی میل دُور ایک جگہ سرسوتی نام کی تھی۔ یہاں کے ساہوکار اِتنے بڑے تھے کہ اُنھوں نے فوج کی تنخواہیں ادا کرنے کے لیے حکومت کو بہت سا روپیہ دے رکھا تھا۔ بلکہ ایک کام تو اُس زمانے میں ایسا بھی ہوتا تھا جیسا آج کل کے بینک بھی کرتے ہیں۔ ان سپاہیوں کو، جو دِلی سے باہر جنگ میں لڑ رہے ہوتے تھے، نقد روپیوں میں تنخواہ نہیں دی جاتی تھی بلکہ ایک پرچہ

دے دیا جاتا تھا جس کو اُس زمانے میں 'اِطلاق' کہتے تھے۔ سپاہی جب چاہے ساہوکار کو یہ پرچہ دِکھا کر اس پر لکھی ہوئی رقم لے سکتا تھا۔ اس میں سے تھوڑی سی کٹوتی یا 'کمیشن' ساہوکار کاٹ لیتا تھا۔ اور دیکھو آج بھی حکومت کے تمام بڑے افسروں کو نقد روپیوں میں تنخواہ نہیں دی جاتی۔ ہمارے مُلک کے سب سے بڑے بینک 'رِزرو بینک' کے چیک ہی دیے جاتے ہیں۔

ہر تجارت میں اور خاص طور سے دوسرے شہروں سے اور بعض موقعوں پر دوسرے مُلکوں سے تجارت میں بھی یہ سیٹھ ساہوکار کام آتے تھے۔ آج بھی یہ کام ہمارے بینک ہی کرتے ہیں۔

پھر مغل بادشاہوں کے زمانے میں تو ان کی حیثیت اور عزّت کچھ اور بھی بڑھ گئی اور یہاں تک ہوا کہ اورنگ زیب نے ایک بنگالی ساہوکار مانک چند اور اس کے چھ بھائیوں کو 'جگت سیٹھ' کا خطاب دیا۔

لیکن یہاں بھی ایک بار پھر اگر وہی بات دُہرا دی جائے تو تمھیں سمجھنے میں آسانی ہوگی کہ یہ ساہوکار، مہاجن، سیٹھ، جگت سیٹھ یا جو کچھ بھی اپنے زمانے میں ان کے نام رہے ہوں عام طور پر صرف اپنے جاننے والوں یا شہر کے بڑے بڑے رئیسوں، تاجِروں اور حکومت کو ہی قرض دیتے تھے۔ ممکن ہے کبھی کبھی یہ کچھ لوگوں کا تھوڑا بہت روپیہ جمع بھی رکھ لیتے ہوں — حفاظت کے لیے یا کسی اور وجہ سے — پھر بھی انھیں ایسا کام کرنے والا نہیں کہا جا سکتا تھا جیسا آج کل بینک کرتے ہیں۔

اچھّا اب ذرا یہ دیکھیں کہ دُنیا کے دوسرے مُلکوں میں اُس زمانے میں کیا حالات تھے۔

یوروپ میں روپیے کا لین دین

اِس سے پہلے کہ ہم یوروپ میں بینکوں کی شروعات اور ان کی ترقّی پر نگاہ ڈالیں، ہمیں یہ بات پہلے سے ہی سمجھ لینی چاہیے کہ بینکوں کی تاریخ دوسری اُن تاریخوں کی طرح بالکل صاف اور سیدھی نہیں ہے جیسی تم اپنی جماعتوں میں پڑھتے ہو۔ اس میں ٹھیک ٹھیک تاریخ بلکہ سنہ کے ساتھ بھی کوئی بات پکّے طور پر نہیں کہی جا سکتی۔

اصل میں اِس کی بڑی وجہ شاید یہی ہے کہ جس وقت بینکوں کی شروعات یا ترقّی ہوئی، اُس وقت خود ان کی اِبتدا کرنے والوں کو بھی یہ احساس نہیں تھا کہ وہ دُنیا کی زندگی کے لیے کوئی اِتنا بڑا کام کر رہے ہیں جو آگے چل کر انسان کے روپیے پیسے کے لین دین، کاروبار، تجارت بلکہ اُن کی پوری زندگی پر اِتنا گہرا اثر ڈالے گا۔ یہ لوگ تو بس اپنے کچھ فائدوں اور آسانیوں کی تلاش میں کچھ نئے نئے کام کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ بعد میں اِنہی کاموں سے ایک پورا نظام یا ایسا چکّر سا بن گیا جس نے ہماری زندگیوں کو گھیر لیا۔

اور اگر سچ پوچھو تو دُنیا کی تمام سماجی ترقّیاں اِسی طرح ہوئی ہیں کہ اُن کے شروع کرنے والوں کو یہ پتہ ہی نہیں ہوتا کہ وہ دُنیا کی سماجی زندگی میں کسی بہت بڑی تبدیلی یا انقلاب کی شروعات کر رہے ہیں۔ مثال کے طور پر جس شخص نے پہلی بار کبوتر کے ذریعے، یا کسی انسان کے ذریعے، اپنا پیغام لِکھ کر کسی دوسری جگہ بھیجا ہوگا اُسے بالکل ہی اِس بات کا احساس نہ ہوا ہوگا کہ وہ ایک ایسا نیا کام یا طریقہ شروع کر رہا ہے جو

دو تین ہزار سال بعد ساری دُنیا کے لوگوں کی زندگیوں پر اثر ڈالے گا۔ اس چھوٹے سے کام کا نتیجہ آج تمھارے سامنے ہے۔ آج ہم ہزاروں میل دُور بیٹھے ہوئے اپنے دوستوں سے صرف خط کے ذریعے ہی بات چیت کر لیتے ہیں۔

ہاں، تو یوروپ کے مُلکوں کی بات ہو رہی تھی۔ لگ بھگ گیارھویں بارھویں صدی سے یوروپ میں تجارت اور کاروبار کا پھیلاؤ بڑھنا شروع ہوا، خود مُلکوں کے اندر بھی اور دوسرے مُلکوں سے بھی۔ اور تم خود ہی سمجھ سکتے ہو کہ جیسے جیسے تجارت اور کاروبار پھیلتا ہے روپیے پیسے کی ضرورت بھی زیادہ پیش آتی ہے اور اس کا چکّر بھی بڑھتا ہے۔ آج بھی شاید ہی کسی مُلک میں کوئی بڑا کارخانہ یا کاروبار ایسا ہو جو صرف ایک آدمی اپنے پیسے سے چلا رہا ہو۔ عام طور پر یہ دولت یا تو بینکوں سے اُدھار لی جاتی ہے یا پھر اس کے بہت سے حصّے (جنھیں انگریزی میں 'شیئرز' (Shares) کہتے ہیں) بازاروں میں بیچے جاتے ہیں۔ خیر بھائی، یہ الگ پھندا ہے۔ اس کو ہم اس وقت کھولنے کی بالکل کوشش نہیں کریں گے۔ اِس وقت تو بس اِتنا ہی جان لینا کافی ہے کہ جِتنا بیوپار یا کاروبار بڑھتا ہے اُتنی ہی روپیے کی ضرورت اور زیادہ پیش آتی ہے۔ اب دیکھیں کہ یوروپ کے بیوپاریوں کی یہ ضرورت کیسے پُوری ہوئی۔

یوروپ کے مُلکوں میں دسویں گیارھویں صدی میں بہت سی خانقاہیں تھیں۔ لوگ اپنا گھر بار چھوڑ کر یہاں آکر رہتے تھے اور عیسائی مذہب کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ ان خانقاہوں کو مذہبی لوگ بھی، اور مُلکوں کی حکومتیں بھی بہت سا روپیہ دیتی تھیں۔ چنانچہ ان میں سے بعض

خانقاہیں بہت پیسے والی ہو گئی تھیں۔ یہ خانقاہیں اپنے آس پاس کے کسانوں، زمینداروں اور بیوپاریوں کو ان کے کاروبار کے لیے قرض دیتی تھیں۔ کبھی کبھی مجبور ہو کر انھیں حکومت کے افسروں اور بادشاہوں کو بھی اُدھار دینا پڑ جاتا تھا۔

پھر ذرا اور آگے بڑھ کر بارھویں، تیرھویں صدی میں یوروپ کے مُلکوں میں روپیے کے لین دین کا کام یہودی قوم کے لوگوں کے پاس آیا۔ یہ لوگ روپیے کے جوڑ توڑ میں شاید دُنیا بھر میں اپنا مقابل نہیں رکھتے تھے۔ ان کے لین دین اور سُود کے متعلّق نہ معلوم کتنی کہانیاں لکھی گئی ہیں اور کتنی مشہور ہیں۔

اب یوروپ میں قرض کی مانگ بہت بڑھ رہی تھی۔ یہ ضروری نہیں تھا کہ ان میں سے ہر ساہوکار کے پاس ہمیشہ اتنا روپیہ موجود ہو کہ وہ اُدھار کی ساری مانگوں کو پُورا کر سکے۔ اِس لیے اُنھیں بھی روپیے کی ضرورت پیش آجاتی تھی۔ اِس کے لیے اُنھوں نے ان لوگوں کا روپیہ جمع رکھنا شروع کر دیا جن کے پاس یہ فالتو پڑا رہتا تھا۔ ان لوگوں کو روپیہ جمع کرانے پر راضی کرنے کے لیے انھوں نے اس جمع پر سُود بھی دینا شروع کیا۔

بس تم دیکھو گے کہ یہیں سے وہ سب سے بڑا کام شروع ہوا جو آج کے بینک کرتے ہیں۔ مطلب یہ کہ صرف روپیہ اُدھار دے دینا ہی بینک کا کام نہیں ہے۔ اصلی بات یہی ہے کہ کچھ لوگوں سے روپیہ لیا جائے —— اُن لوگوں سے جن کے پاس فالتو پڑا ہوا ہے —— اور اُسے اُن لوگوں تک پہنچایا جائے جنھیں اس کی ضرورت ہے اور جو اسے کسی کاروبار، تجارت یا کارخانے کے کاموں میں لگانا چاہتے ہیں۔ یوروپ میں اس زمانے میں یہی بڑا کام

انجام دیا گیا۔

سونے کا انڈا دینے والی مُرغی

اگر تم اُس وقت کی یوروپ کی تاریخ دیکھو تو تمھیں ایک اور بات بھی نظر آئے گی، جس کا اثر روپیے کے لین دین پر بھی بہت پڑا۔ اُس زمانے میں یوروپ میں چھوٹی چھوٹی بہت سی ریاستیں یا مُلک تھے —— برطانیہ، اٹلی، فرانس، اسپین وغیرہ۔ ان کی الگ الگ حکومتیں تھیں اور جب حکومت الگ تھی تو ظاہر ہے ان کے سِکّے بھی الگ تھے۔ کچھ بالکل اصلی سونے چاندی کے اور کچھ ملاوٹ والی دھاتوں کے۔ اب ان کے لین دین میں لوگوں کو اور ان حکومتوں کو بھی بڑی مشکل پیش آتی ہوگی۔ کِس سِکّے کے بدلے میں دوسرے کِتنے سِکّے لیے یا دیے جائیں؟ یہ مسئلہ ہمیشہ ہی پریشان کرتا رہتا تھا۔

اِس کی وجہ سے کچھ لوگوں نے روپیے پیسے کے بدلنے کا کاروبار ہی شروع کر دیا۔ انھیں تم اپنی زبان میں صرّاف بھی کہہ سکتے ہو۔ حکومتوں نے بھی اپنی طرف سے کچھ پیسے والوں کو روپیہ پیسہ بدلنے کے کاروبار کی اجازت دے دی۔ خود ہمارے مُلک میں بھی نہ معلوم کب سے یہی کام مہاجن کرتے چلے آرہے تھے جِنھیں بعد میں صرّاف بھی کہا جانے لگا تھا۔ یوروپ میں روپیے پیسے کے لین دین کا کاروبار کرنے والے لوگوں کے پاس اِسی قسم کے بہت سے کام تھے۔ جیسے سِکّوں کو پرکھنا، ان کی دھات کے متعلق بتلانا کہ اِس میں کِتنی ملاوٹ ہے، اگر لوگ ان کے پاس سونا چاندی لے جائیں تو اُس کی جانچ کرکے سِکّے ڈھالنا، خود حکومت کے لیے بھی سِکّے ڈھالنا۔ وغیرہ وغیرہ۔

اگر ہندوستان کے مہاجنوں، سیٹھوں اور یوروپی مُلکوں کی خانقاہوں

اور یہودیوں نے بینک کی شروعات میں جڑ کا کام دیا تو ان روپیہ بدلنے والوں یا صرّافوں نے بھی وہ کام دیا جو کسی پیڑ کا تنا پورے پیڑ کی اُٹھان میں انجام دیتا ہے۔ ان کے پاس بہت سی دولت یعنی روپیہ پیسہ اور قیمتی دھاتیں ہوتی تھیں۔ اور ان کو رکھنے کی حفاظت کا بہت اچھا انتظام یا مضبوط تجوریاں بھی ہوتی تھیں۔ جو تاجر یا کاروباری لوگ ان سے جان پہچان رکھتے تھے وہ حفاظت کے خیال سے اپنی دولت ان کے پاس جمع کر دیتے تھے۔ حالانکہ اس کے لیے انھیں کچھ فیس دینی پڑتی تھی۔

اب ذرا سا بیچ میں تمھیں یہ بھی بتلاتے چلیں کہ اس لفظ 'بینک' کی جڑیں بھی کہیں اسی زمانے میں ملتی ہیں۔ اصل میں یہ صرّاف یا روپیہ بدلنے والے لوگ بازاروں میں ایک بینچ پر بیٹھتے تھے، جسے اس وقت کی اطالوی زبان میں 'Banco' یا 'Banque' کہا جاتا تھا۔ بس اِسی سے یہ لفظ بعد میں انگریزی زبان میں 'بینک' (Bank) میں بدل گیا۔ اور یہ بھی سُنا ہے کہ جب کسی صرّاف کا کاروبار بیٹھ جاتا تھا اور وہ دیوالیہ ہو جاتا تھا — جسے انگریزی میں 'Bankruptcy' کہتے ہیں — تو اس کی بینچ توڑ دی جاتی تھی۔

شروع شروع میں تو روپیے پیسے کے یہ معاملات سیدھے سیدھے ہی چلتے رہے۔ مثال کے طور پر ایک بیوپاری آیا اور فرض کرو کہ ایک ہزار روپیے اس یوروپی صرّاف کے پاس جمع کرا گیا۔ اب اسے شہر کے کسی دوسرے بیوپاری کو دینے کے لیے پانچ سو روپیے کی ضرورت پیش آئی۔ دونوں بیوپاری صرّاف کے پاس آئے۔ پہلے نے اپنے حساب میں سے پانچ سو روپیے لیے اور دوسرے بیوپاری کو دے دیے، دوسرا بیوپاری انھیں لے کر یا تو اپنے گھر چلا گیا یا اگر اتفاق سے اُس بیوپاری کا روپیہ بھی اِسی صرّاف کے پاس جمع تھا تو اُس نے

یہ پانچ سَو اپنے حساب میں جمع کرا دیے۔ صرّاف نے اب انھیں اس دوسرے بیوپاری کے نام پر چڑھا دیا اور روپیہ پھر تجوری میں رکھ لیا۔

پھر جب یہ کام بار بار ہونے لگا تو پہلے والے بیوپاری نے سوچا کہ بار بار وہ خود کیوں صرّاف کے پاس جانے کی تکلیف اُٹھائے۔ اس نے دوسرے بیوپاری کو ایک پرچہ دے دیا جس میں صرّاف سے کہا گیا تھا کہ وہ اس کے حساب میں سے کچھ روپیے نکال کر دوسرے کے حساب میں ڈال دے۔ صرّاف کے پاس جب یہ پرچہ پہنچا تو اس نے اپنے کھاتوں میں پہلے والے بیوپاری کے کھاتوں سے یہ رقم کم کر دی اور دوسرے کے کھاتوں میں چڑھا دی۔ یہ صحیح ہے کہ کچھ لوگوں کو نقد روپیے کی اُسی وقت یا فوراً ہی ضرورت پیش آتی ہوگی اور وہ صرّاف سے نقد روپیہ لے لیتے ہوں گے۔ لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ضرور ہوتے ہوں گے جنھیں اُس وقت اس روپیے کی ضرورت نہیں ہوتی ہوگی۔ جس کا مطلب ہوا کہ روپیہ تو صرّاف کے پاس تجوری میں ہی رکھا رہا اور ایک بیوپاری نے دوسرے کو ادا بھی کر دیا۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہو جاتا تھا کہ کسی بیوپاری کے حساب میں اتنا روپیہ نہیں ہے جتنا اُسے فوراً ادا کرنا ہے۔ ایسی حالت میں بھی وہ اپنے صرّاف کے پاس جاتا اور کہتا کہ وہ اسے کچھ زیادہ پیسے دے دے۔ صرّاف اِس وعدے یا شرط پر روپیہ دینے کے لیے تیّار ہو جاتا کہ بیوپاری اس رقم کو بھی صرّاف کے پاس ہی جمع کرائے گا، اور جب جب جتنی ضرورت پیش آئے گی نکلواتا رہے گا۔ صرّاف بیوپاری کو اس کی جمع سے زیادہ روپیہ دینے کے لیے اِس لیے تیّار ہو جاتا تھا کہ اسے یقین ہوتا تھا کہ سارا روپیہ اس کی تجوری سے باہر تو جائے گا نہیں، اس کا کچھ حصّہ تو تجوری میں ہی رہے گا۔

اور ظاہر ہے کہ یہ تو بیوپار کا معاملہ ہے، خیرات تو ہے نہیں، وہ جب اُدھار دیتا تھا تو اس کے لیے ضمانت بھی رکھواتا تھا اور سُود بھی لیتا تھا۔

اِس سارے چکر میں جو بات سب سے خاص اور نئی تھی وہ یہی تھی کہ روپیہ تو تجوری میں ہی رکھا رہتا تھا لیکن ایک طرف سے دوسری طرف ادائیگی بھی ہو جاتی تھی، اور دینے والے اور لینے والے دونوں بیوپاریوں کی مانگیں بھی پُوری ہو جاتی تھیں۔ اور سچ مچ یہ اِتنی بڑی یا اہم بات تھی کہ اِسے ہم نئے بینکوں کی بُنیاد یا ان کا پہلا اصول بھی کہہ سکتے ہیں۔ اچھا اِسی چیز کو ذرا تھوڑے سے مختلف ڈھنگ سے دیکھنے کی کوشش کرو۔

اصل میں ہوا یہ کہ ان صرّافوں نے کچھ دن بعد دیکھا کہ ان کے پاس جو لوگ روپیہ جمع کرانے آتے ہیں وہ سارا کا سارا روپیہ ایک دم نہیں نکال لیتے، یا جن کو پرچہ لکھ کر دیتے ہیں وہ بھی سب کا سب ایک ساتھ ہی نہیں لے لیتے۔ اگر کچھ نقد لیتے بھی ہیں تو اپنی پُوری رقم میں سے کچھ حصّہ اپنے حساب میں چھوڑ جاتے ہیں۔ جِس کا مطلب ہے کہ ساری جمع کا ایک خاصہ بڑا حصّہ صرّاف کی تجوری میں ہی رہتا ہے۔ اور پھر ان صرّافوں کو تو لوگوں کو سُود پر اُدھار دینے کے لیے ہمیشہ ہی روپے کی ضرورت رہتی تھی۔

بس اب انھوں نے کیا یہ کہ لوگوں کا جو روپیہ ان کے پاس جمع رہتا تھا اس میں سے بھی کچھ حِصّے کو اُدھار پر چلانا شروع کر دیا۔ یہ لوگ روپیہ جمع کرانے والوں سے اس کی اجازت نہیں لیتے تھے۔ یہ تو چُھپے چوری کا کام تھا۔ بہت دن کے تجربے سے یہ بات پہلے ہی ان کی سمجھ میں آ گئی تھی کہ کسی دن بھی روپیہ جمع کرانے والے لوگ ان کے پاس ایک ساتھ روپیہ لینے نہیں آ جاتے۔ اگر کچھ لوگ اپنا روپیہ واپس نکالتے ہیں تو اُسی روز کچھ لوگ اپنا روپیہ

جمع کرانے بھی ضرور آجاتے ہیں اور تجوری میں کافی روپیہ ہر وقت موجود رہتا ہے۔

اگر سچ پوچھو تو 'وہ مُرغی' انہی لوگوں کے ہاتھ لگی تھی جو سونے کے انڈے دیتی تھی۔

فرض کرو ایک صرّاف کو بہت دن روپیے کا کاروبار کرنے کے بعد یہ یقین ہو گیا کہ اگر اس کے پاس کسی وقت سَو روپیے جمع کروائے جائیں اور وہ ان میں سے بیس روپیے ہمیشہ تجوری میں رکھے رہے اور ساتھ ہی لوگ روزانہ اپنا کچھ روپیہ جمع کرانے آتے رہیں تو نِکلوانے والوں کی مانگوں کو پورا کرنے کے لیے یہ سب روپیے کافی ہوتے ہیں اور جو شخص بھی اپنی جمع میں سے کچھ روپیہ نِکلوانے آتا ہے اُسے کبھی خالی ہاتھ نہیں لوٹایا جاتا۔ اب ایسی صورت میں وہ یہ سوچ سکتا ہے کہ یہ اسّی روپیے جو اس کی تجوری میں بیکار پڑے رہتے ہیں، یہ بھی اُدھار دیے جا سکتے ہیں۔ اُن کو اُدھار دینے سے اُسے کسی قسم کی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ روپیہ نِکلوانے والوں کی مانگوں کو پورا کرنے کے لیے اوّل تو وہی روپیہ کافی ہوگا جو اُس دن کچھ لوگ جمع کروانے آئیں گے اور اگر کبھی اس سے زیادہ روپیے کی ضرورت پیش آئی بھی تو اس کی تجوری میں محفوظ رکھے ہوئے بیس روپیے سے کام چل جائے گا۔ اور پھر جب وہ کسی کو اُدھار دیتا ہے تو ضمانت کے ساتھ ساتھ یہ بھی شرط لگا دیتا ہے کہ اُدھار لینے والا آدمی یہ روپیہ بھی اِسی کے پاس جمع کرائے گا اور جب جب جتنی ضرورت ہوگی اپنے حساب میں سے نِکلواتا رہے گا۔ اور پھر تجربے نے اُسے یہ بھی بتلا دیا کہ اگر وہ سَو روپیے اُدھار پہ اُٹھاتا ہے تو ان میں سے تیس روپیے تو فوراً ہی نقد چلے

جاتے ہیں اور ستر روپیے پھر اس کے پاس تجوری میں باقی رہ جاتے ہیں یا فوراً
ہی لوٹ آتے ہیں۔ اب بھائی سُود کو تو ذرا دیر کے لیے الگ رکھو اور یہ دیکھو کہ
ان دونوں اصولوں کا اس کے کاروبار پر کیا اثر پڑتا ہے۔

اب یہاں سے چلتے ہیں کہ اس کی اپنی رقم یا جسے ہم اس کا ابتدائی سرمایہ
کہہ سکتے ہیں، پانچ ہزار روپیے ہے اور شروع میں لوگوں نے اس کے پاس
پانچ ہزار روپیے اور جمع کر دیے ہیں۔ اس طرح کاروبار شروع کرتے وقت
اس کے پاس کُل دس ہزار روپیے ہیں جن سے وہ اُدھار دینے کا کام شروع
کرتا ہے۔ اب ذرا تم بھی ان سیڑھیوں کو ذرا سا دھیان لگا کر سمجھنے کی
کوشش کرو۔

(کُل ابتدائی سرمایہ 10 000 روپیے)

	تجوری میں محفوظ (رزرو) 20 فیصدی)	اُدھار دی گئی رقم	اُدھار میں سے فوراً نقد ادا کی رقم 30 فیصدی)	اُدھار میں سے فوراً واپس آجانے والی رقم
پہلا اُدھار	(10,000 کا 20 فیصدی) 2,000 روپے	8000 روپے	2,400 روپے	5,600 روپے
دوسرا اُدھار	(56,00 کا 20 فیصدی) 1,120 روپے	4,480 روپے	1,344 روپے	3,136 روپے
تیسرا اُدھار	(3,136 کا 20 فیصدی) 627 روپے	2,509	753 روپے	1,756 روپے
چوتھا اُدھار	(1,756 کا 20 فیصدی) 351 روپے	1,405 روپے	422 روپے	983 روپے
پانچواں اُدھار	983 کا 20 فیصدی 197 روپے	787 روپے	236 روپے	551 روپے

پانچواں اُدھار

(551. کا 20 فیصدی)　110 روپے

چھٹا اُدھار　441 روپے　132 روپے　309 روپے

(309. کا 20 فیصدی)　62. روپے

ساتواں اُدھار　روپے　روپے　173 روپے

تجوری میں کُل محفوظ رقم　4,467 روپے

ساتویں اُدھار کے بعد باقی رقم　173 روپے

کُل موجود رقم　4640

کل اُدھار دی گئی رقم　17,869 روپے

اب دیکھا تم نے کہ اِس چکّر سے کیا نتیجہ نکلا۔ کاروبار شروع کیا تھا صرف 5,000 روپے سے، اور پانچ ہزار روپیے کچھ لوگ اس کے پاس جمع کرا گئے تھے، لیکن تھوڑے ہی دن بعد حساب یہ تھا کہ لگ بھگ ساڑھے چار ہزار روپے اس کے پاس تجوری میں موجود تھے، اور اٹھارہ ہزار سے کچھ کم روپیے اس نے اُدھار دیے ہوتے تھے —— بولو بھائی! تھی نا یہ سونے کے انڈے دینے والی مُرغی!! اور سُود کا حساب ہم نے کیا نہیں ہے۔ اصل میں ہم نے تو یہ حساب بالکل سیدھے سادے طریقے سے کیا ہے۔ اگر سچ پوچھو تو یہ اُدھار اِس سے بہت زیادہ ہوتا ہے۔

بس، یہی وہ راز یا گُر تھا جو ان صرّافوں یا روپیہ بدلنے والوں کی سمجھ میں آگیا تھا۔

پھر انہی صرّافوں کے پاس روپیے کے لین دین کے سِلسلے میں کچھ اور کام بھی تھے۔ جس طرح ہندوستان کے سپاہیوں کو تنخواہوں کی پرچیاں مِلتی تھیں اور وہ کچھ کٹوتی کٹواکر انھیں مہاجنوں سے بھنوا لیتے تھے، یوروپ کے مُلکوں میں بھی یہ کام ان صرّافوں کے سپرد تھا، جو کٹوتی پر تنخواہوں کی پرچیاں —— یا اگر تم چاہو تو چیک کہہ لو —— بھناتے تھے۔ تاجروں کو تجارت کے لیے روپیہ فراہم کرنا، ان کا مال روپیہ دے کر چھُڑانا، اور ان کے 'پٹّوں' پر (جنھیں انگریزی میں 'Bills of Exchange' اور ہندی میں 'ہُنڈی' کہتے ہیں) کمیشن لے کر روپیہ دینا بھی انہی صرّافوں یا روپیے کا لین دین کرنے والوں کا کام تھا۔ کچھ صرّاف تو خود بھی تجارت کرتے تھے چونکہ روپیے کی ان کے پاس کمی نہیں تھی، دوسرے مُلکوں کے صرّافوں سے ان کا روپیے کا لین دین پہلے سے ہی موجود تھا۔ اِسی لیے بعد میں یہ لوگ 'بیوپاری بینک کار' یا انگریزی میں 'Merchant Bankers' کے نام سے بھی جانے جاتے تھے۔

پھر ان کا کچھ تعلق حکومتوں سے، بادشاہوں اور سرکاری افسروں سے بھی ہوگیا۔ حکومتوں کو اپنے خرچ چلانے، سپاہیوں کو تنخواہیں دینے اور آئے دن ہونے والی جنگوں کے لیے، اور کبھی کبھی تو بیکار کے خرچوں کے لیے بھی ضرورت پیش آتی تو بادشاہ، حکومت کے شعبے، شاہزادے اور سرکاری افسر اِنھی کا سہارا لیتے۔ اِس کے بدلے میں وہ انھیں جائز اور ناجائز آسانیاں بھی دے دیتے۔ چنانچہ یہ صرّاف اور 'تاجر بینک کار' آہستہ آہستہ بہت مضبوط ہوتے چلے گئے۔ اور سچ پُوچھو تو یہی مضبوطی ان کی تباہی کی بُنیاد بھی بنی۔

تم نے وہ کہانی تو سُنی ہی ہوگی کہ جس آدمی کے ہاتھ سونے کے انڈے دینے والی مُرغی لگ گئی تھی۔ وہ اِس بات سے بہت بے چین رہتا تھا کہ اُسے

سونے کا انڈا حاصل کرنے کے لیے پورے ایک دن انتظار کرنا پڑتا ہے۔ بس ایک دن یہی سوچ کر کہ کیوں نہ سارے انڈے ایک ساتھ ہی حاصل کر لیے جائیں، اُس نے مُرغی کا پیٹ کاٹ دیا ——— نتیجہ میں کیا بتاؤں، تم خود ہی سمجھ سکتے ہو۔

بس ہوا یہی کہ ان بیوپاریوں کے پاس دولت اور طاقت دونوں ایک ساتھ جمع ہو گئیں۔ انھوں نے آنکھیں بند کر کے اُدھار دینا شروع کر دیا۔ پہلے سمجھ دار بیوپاریوں نے جو اصول بنایا تھا کہ ایک مقررہ رقم (جو ابھی تھوڑی دیر پہلے ہم 20 فیصدی فرض کر چکے ہیں) ہمیشہ اپنے پاس تجوری میں محفوظ یا رزرو رکھیں گے، بعد کے بینک کاروں نے اِس کا خیال بھی چھوڑ دیا۔ پھر حکومت یا شہزادوں اور امیروں نے بھی بہت بڑے بڑے قرضے لینے شروع کر دیے۔

بادشاہی حکومتیں تو تم جانو چڑھتی اُترتی رہتی ہیں، بادشاہ بدلتے رہتے ہیں، جنگوں میں ہارتے جیتتے رہتے ہیں۔ اب جیسے ہی کوئی بادشاہت ختم ہوئی، کوئی امیر یا شہزادہ دیوالیہ ہوا، تو ساتھ ہی ساتھ اس کو اُدھار دینے والے بینک کاروں یا صرّافوں کا بھی دیوالہ نِکلا۔

ابھی تھوڑی دیر پہلے اُدھار کی رقموں کا جو نقشہ تم نے دیکھا تھا اسے دیکھ کر تمھیں کچھ حیرت ضرور ہوئی ہوگی کہ کاروبار شروع کرتے وقت کُل رقم تھی صرف دس ہزار، اور تھوڑے سے دِنوں میں ہی کوئی اٹھارہ ہزار روپیے تو اُدھار دے دیے گئے اور کوئی ساڑھے چار ہزار روپیے تجوری میں بھی موجود رہے۔ یہ سب کیسے ہو گیا ———؟ اصل میں یہ تو صرف روپیے کا چکّر، یا اس کے اُدھار کا 'پھیلاؤ' تھا۔ اصلی رقم وہی دس ہزار روپیے تھی۔ جمع کرانے والے ہر شخص کو یہ اعتبار بلکہ یقین تھا کہ وہ جب چاہے گا اپنا

روپیہ واپس لے آئے گا۔ بس اِسی 'اعتبار' کی کیلی پر یہ پہیہ گھوم رہا تھا۔ اب جب بھی اور جیسے ہی اعتبار کی یہ کیلی ذرا ہِلے گی اور ہر شخص ایک ساتھ اپنا روپیہ لینے بینک کار کے پاس واپس دوڑے گا۔ سارا چکّر ٹوٹ جائے گا۔ ظاہر ہے کہ بینک کار کے پاس اِتنا روپیہ تو کسی وقت بھی نہیں ہوتا کہ وہ ہر جمع کرانے والے کا سارا روپیہ ایک ساتھ ادا کر دے۔

چنانچہ جیسے ہی کسی بینک کار کے متعلّق جھوٹی یا سچّی افواہ اڑتی کہ اس کا دیا ہوا کوئی بہت بڑا اُدھار مارا گیا ہے تو اس کے سارے گاہک اپنا سارا روپیہ نقد واپس لینے دوڑ پڑتے۔ لوگ ڈر کے مارے اپنی ضمانتیں بھی واپس لے لینا چاہتے تھے۔ نتیجہ بالکل صاف تھا ـــــ شروع میں آنے والوں کو تو روپیہ واپس مِل جاتا اور اس کے بعد لوگ نااُمید واپس لوٹتے۔ اور پھر یہ نقصان انھیں ہی اُٹھانا پڑتا۔

بس نتیجہ یہ ہوا کہ سولھویں صدی کے آخر تک بہت سے بڑے بڑے صرّافوں یا تاجر بینک کاروں کی کمپنیاں ناکام ہو کر ختم ہو گئیں۔ سونے کے انڈے دینے والی مُرغی کے پَر نکل آتے اور وہ کسی اور کی گود میں جا بیٹھی۔

مگر ان تاجر بینک کاروں اور صرّافوں نے چند اصول اور بینک کے کاروبار کی کچھ بُنیادیں ضرور پکّی کر دیں۔

میونسپلٹیوں کے تبادلہ بینک

خیر یہ سیٹھ ساہوکار یا جنھیں ہم نے روپیے بدلنے والے 'صرّاف' یا 'تاجر بینک کاروں' کا نام دیا تھا، ان میں سے بہت سوں کا کاروبار تو ختم ہو گیا اور ان کے ساتھ ساتھ بہت سے اور لوگوں کا بھی نقصان ہوا، مگر اس کے

ساتھ ہی ایک بنا بنایا اور پکّا نظام بھی ٹوٹ گیا۔ تاجروں کو تو عادت پڑگئی تھی کہ وہ کھاتوں میں پھیر بدل سے ہی اپنی رقمیں ادا کر دیتے تھے اور وصول کر لیتے تھے۔ وہ شہر میں ہر جگہ روپیوں کا بوجھ اُٹھائے پھرنے سے بچے ہوئے تھے۔ اب وہ کیا کریں؟

اب کی بار شہر کی میونسپلٹیوں نے اس کام کو شروع کیا۔ ان کے کھولے ہوئے بینک خاص طور پر بیوپاریوں کی رقموں کے تبادلے کا کام کرتے تھے۔ وہی کام جو شروع شروع میں ان کے بُزرگ، یعنی 'صرّافوں' اور 'مہاجنوں' کے بینکوں نے کیا تھا۔ جو بیوپاری اپنا روپیہ ان بینکوں میں جمع کراتے تھے ان کو اِس بات کا یقین دلایا جاتا تھا کہ ان کا روپیہ کسی طرح بھی خرچ نہیں کیا جائے گا، نہ کسی کو اُدھار دیا جائے گا۔ اِسی لیے انھیں صرف 'تبادلہ بینک' کا ہی نام دیا جا سکتا ہے۔ ایسا سب سے پہلا بینک یوروپ میں اسپین مُلک کے ایک بہت بڑے ساحلی شہر بارسیلونا میں 1401 میں ہی قایم ہو گیا تھا۔ اُس وقت یہ شہر یوروپ کے بہت بڑے تجارتی مرکزوں میں گِنا جاتا تھا اور یہاں پُورے یوروپ سے تاجر آتے جاتے تھے۔ لیکن اِس کے بعد جلد ہی یوروپ کے دوسرے مُلکوں میں بھی ایسے 'تبادلہ بینک' قائم ہوتے چلے گئے۔ ظاہر ہے کہ چونکہ ان بینکوں سے لوگوں کو اُدھار نہیں دیا جاتا تھا، اور اس بینک کی آمدنی کا کوئی اور ذریعہ بھی نہیں تھا، اِس لیے جمع کرانے والوں کو بھی کوئی سُود نہیں مِلتا تھا، بلکہ انھیں کچھ فیس ادا کرنی پڑتی تھی۔ اصل میں روپیے کے جمع کرانے پر تو صرف اُسی صورت میں سُود دیا جا سکتا ہے جب وہ روپیہ آگے کسی کو اُدھار دیا جائے یا اُس سے کوئی اور کاروبار کیا جائے۔

لیکن کچھ دن بعد یہ بینک بھی اُدھار دینے کے چکّر سے محفوظ نہ رہ سکے۔ چونکہ انھیں شہروں کی میونسپلٹیوں نے قائم کیا تھا اِس لیے ان پر حکومت کا قبضہ تھا اور انھیں کبھی کبھی حکومت کے شعبوں کو اُدھار دینا پڑ جاتا تھا۔

دوسری طرف مہاجنوں، صرّافوں، سُناروں اور تاجر بینک کاروں کا کاروبار بھی بالکل ختم نہیں ہوا تھا۔ ان میں سے بعض بیوپاریوں نے تو آہستہ آہستہ باقاعدہ کمپنیاں بھی بنانی شروع کر دی تھیں۔ یہ کمپنیاں بیوپاریوں کو اُدھار بھی دیتی تھیں اور ان کا روپیہ جمع بھی رکھتی تھیں۔ پہلے کی طرح اب بھی کبھی کبھی انھیں حکومت کے کچھ شعبوں یا ان کے افسروں کو بڑی بڑی رقمیں اُدھار دینا پڑتی تھیں۔

سُناروں اور مہاجنوں کا راج

صرّافوں اور تاجر بینک کاروں کے پاس سے یہ سُنہری مُرغی اُڑ کر کچھ دن مہاجنوں یعنی سُود پر روپیہ اُدھار دینے والوں کے پاس رہی۔ بعض جگہ یہودیوں نے پھر یہ کاروبار سنبھالا۔ کچھ شہروں میں میونسپلٹیوں نے بھی بینک کھول رکھے تھے۔ لیکن آخر میں یہ مُرغی سُناروں کی گود میں آ بیٹھی۔

یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ اُس زمانے میں سکّے زیادہ تر سونے چاندی کے ہوتے تھے۔ تاجروں کو اپنے لین دین اور خریدے ہوئے سامان کی قیمت چُکانے کے لیے سونے کی سب سے زیادہ ضرورت پیش آتی تھی اور اسی لیے انھیں ہمیشہ اپنے پاس کافی سونا رکھنا پڑتا تھا۔

لندن میں ایک مشہور تاریخی عمارت ہے جسے لندن کا مینار (Tower of London) کہتے ہیں۔ یہ دسویں صدی میں بنا تھا اور آج کل یہاں

حکومت کا کچھ قیمتی سامان حفاظت سے رکھا جاتا ہے اور ایک میوزیم بھی ہے۔ سترھویں صدی میں یہاں سرکاری ٹکسال تھی اور حکومت کا خزانہ بھی یہیں رکھا جاتا تھا۔ انگلینڈ کے بڑے بڑے تاجر بھی حفاظت کے خیال سے اپنا سونا یہیں جمع کروا دیتے تھے اور جب جب ضرورت پیش آتی تھی نکلوا لیتے تھے۔ یہ کوئی بینک نہیں تھا۔ چونکہ حکومت خود اپنی دولت کی وجہ سے اِس جگہ کی بہت حفاظت کرتی تھی، اِس لیے بیوپاری بھی اپنی قیمتی دھاتیں یہاں جمع کروا دیتے تھے۔

1625 میں انگلینڈ پر ایک بادشاہ چارلس اوّل کی حکومت شروع ہوئی۔ اس بادشاہ کی حکومت کا سارا زمانہ خانہ جنگی میں گزرا اور بادشاہ اور اس مُلک کی پارلیمنٹ کے درمیان جھگڑا اور لڑائی ہی چلتی رہی۔ ایک بار جب اسے روپیے کی بہت سخت ضرورت پیش آئی تو اس نے تاجروں سے اُدھار مانگا۔ تاجر اُدھار دینے کے لیے تیار نہیں ہوئے تو اس نے 'لندن مینار' میں رکھا ہوا سارا سونا ضبط کر لیا، اور اُس وقت تک واپس نہیں کیا جب تک یہ لوگ اُدھار دینے کے لیے تیار نہیں ہو گئے۔ بس اس کے بعد تاجروں نے 'لندن مینار' میں سونا چاندی جمع کرانا بند کر دیا۔ اور اِس بات سے سُناروں کی بن آئی۔

لندن کے سُنار بہت دولت مند لوگ تھے اور ان کے پاس خود اپنی دولت، خاص طور پر سونے چاندی کی حفاظت کا بھی بڑا اچھا انتظام تھا۔ اب تاجروں اور پیسے والوں نے سوچا کہ انہی سُناروں کے پاس اپنا سونا بھی جمع کروایا جائے۔ اب تم جانو سُنار تو سُنار ہی ہوتا ہے۔ سونے کی جتنی قدر یہ کرتا ہے شاید ہی کوئی اور کرتا ہو۔

کہتے ہیں سُنار سونے کو کسی حالت میں ضائع نہیں ہونے دیتا۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ سُنار کے پاس مٹّی کا ایک کافی بڑا آدھا گھڑا سا ہوتا ہے جس میں وہ آگ جلا کر سونا تپاتا ہے اور ایک لمبی سی نلی سے پھونکتا رہتا ہے۔ اب تم سمجھو کہ جب وہ سونے کو تپاتا اور کوٹتا ہے تو اس میں سے کچھ بہت چھوٹے چھوٹے ذرّے راکھ میں بھی گر سکتے ہیں۔ یہ کتنے چھوٹے ہوں گے اِس کا اندازہ کم سے کم میں تو نہیں لگا سکتا۔ تم خود ہی سمجھ لو۔ بس جناب سُنار صاحب اس راکھ کو بھی یوں ہی نہیں پھینک دیتے۔ اس میں سے بھی کسی نہ کسی طرح وہ یہ ذرّے ڈھونڈ نکالتے ہیں۔

اور پھر ایک طریقہ تو ہندوستان میں ہی بہت پُرانے زمانے سے چلا آرہا ہے۔ گوند یا لاکھ جیسی ایک چیز ہوتی ہے جسے 'رال' کہتے ہیں۔ اِس میں چپک بھی ہوتی ہے اور یہ آگ میں جل بھی جاتی ہے۔ سُناروں کے پاس اس کا ایک گولہ ہوتا ہے، یہ اپنی دُکان کے فرش پر اس گولے کو رگڑتے رہتے ہیں اور اسی سے اس کسوٹی کو بھی پونچھتے رہتے ہیں جس پر پرکھنے کے لیے سونے کو گھِسا جاتا ہے۔ بہت دن ایسا کرتے رہنے سے اس گولے میں سونے کے بہت باریک ذرّے چپک جاتے ہیں۔ رال کے گولے کو جلا دیا جاتا ہے اور سونے کے وہ ذرّے نکال لیے جاتے ہیں۔

اب تم خود سمجھ لو کہ جب ان کے پاس لوگوں نے سونا یا سونے چاندی کا روپیہ رکھا ہوگا تو انھوں نے کیا کیا کرتب نہ دکھائے ہوں گے۔

یہ اپنے بُزرگوں یعنی صرّافوں اور تاجر بینک کاروں سے بینک کے کاروبار کا پُورا سبق پہلے ہی حاصل کر چکے تھے۔ انھیں معلوم تھا کہ اگر سرمایے یا روپیے کا چکّر صحیح طرح چلایا جائے تو دولت خود بخود بھی پیدا ہونے لگتی ہے۔ تم نے

تھوڑی دیر پہلے دیکھا ہی تھا کہ اگر کچھ اصولوں پر عمل کرتے ہوئے روپیے کو اُدھار اُٹھایا جائے تو وہ خود بخود کتنا بڑھ جاتا ہے۔ بس انھوں نے جو سب سے پہلی بات کی وہ یہی تھی کہ جب کوئی شخص ان کے پاس اپنا سونا چاندی یا سکّے جمع کرانے آتا تو یہ شہری میونسپلٹیوں کے کھولے ہوئے 'تبادلہ بینکوں' کی طرح اس سے یہ نہیں کہتے تھے کہ اس کا روپیہ استعمال نہیں ہوگا ویسا کا ویسا اچھوتا ہی رکھا رہے گا۔ یہ اُسے صاف طور پر بتلا دیتے تھے کہ ان کا روپیہ اُدھار پر چلایا جائے گا۔ بس جمع کرانے والے کو اتنا یقین ضرور دلا دیا جاتا تھا کہ جب کبھی بھی وہ روپیہ مانگے گا تو اُسے مِل ضرور جائے گا۔ ظاہر ہے کہ کسی جمع کرانے والے کا اِس میں کیا نقصان ہے؟ اور خاص طور پر ایسی صورت میں کہ جب اسے اپنی جمع پر کچھ سُود بھی ملنے کی اُمّید ہو۔

اب جب سُنار جمع کرانے والے کو سُود دیتے تھے تو یہ بھی خیال رکھتے تھے کہ جو جتنے زیادہ وقت کے لیے ان کے پاس اپنی رقم جمع کرائے گا اُسے اُتنا ہی زیادہ سُود دیا جائے گا۔ اور ایسے لوگ جو اپنی رقم کی واپسی کے لیے کوئی وقت مقرّر نہیں کرتے تھے اور یہ چاہتے تھے کہ جب وہ چاہیں انھیں ان کا پیسہ واپس مِل جائے، تو یا تو انھیں بہت تھوڑا سا سُود مِلتا تھا، یا پھر بالکل بھی نہیں مِلتا تھا۔ جب آج کل کے بینکوں کے بارے میں تم آگے پڑھو گے تو تمھیں یہ معلوم ہوگا کہ بالکل یہی اصول آج کل بھی اپنایا جاتا ہے۔

کاروبار کے اصول بھی وہی تھے جو اس سے پہلے تم دیکھ چکے ہو۔ یعنی جتنی بھی رقم جمع کروائی جاتی تھی اس کا ایک مقرّرہ حصّہ (فرض کرو 20 فیصدی) تو تجوریوں میں محفوظ یا 'رزرو' رکھ لیا جاتا تھا، تاکہ جب کوئی جمع کروانے والا اپنا روپیہ مانگے تو اسے دے دیا جائے۔ یہاں بھی وہی بات تھی کہ ہر روز

کچھ لوگ روپیہ جمع کروانے آتے تھے اور کچھ نکلوانے آتے تھے۔ بس جو فالتو رقم ہوتی تھی اُسے اُدھار پر اُٹھا دیا جاتا تھا۔ مگر شرط وہی ہوتی تھی کہ ہر اُدھار لینے والا اپنا کھاتہ وہیں کُھلوائے گا۔ جب جب اور جتنی جتنی رقم کی اُسے ضرورت ہوگی وہ لیتا رہے گا۔ اس طرح ہر اُدھار دی گئی رقم سُنار کے یہاں جمع کا ایک نیا کھاتہ کھول دیتی تھی — مطلب یہ کہ انھوں نے بھی لگ بھگ وہی اصول اپنائے جو ان کے بُزرگ صرّاف اور تاجر' بینک کار' اپنا چکے تھے۔

پھر اس کے ساتھ ہی ساتھ کھاتوں ہی کھاتوں میں رقموں کا ایک نام سے دوسرے نام پر تبادلہ بھی ہو جاتا تھا۔ جس کا مطلب ہوا کہ رقم تو سُنار کی تجوری میں ہی رہی اور دینے والے نے ادا بھی کر دی اور لینے والے نے وصول بھی کر لی۔

مگر جو کام ان سُناروں نے بینک کی تاریخ میں سب سے بڑا کیا وہ وہی تھا جہاں سے ہم نے یہ پھندے کھولنے شروع کیے تھے۔ یہ صرف بینک کی تاریخ میں ہی نہیں بلکہ ہماری دولت، ہمارے سرمایے یا روپیے پیسے کی تاریخ میں بھی سب سے اہم کہا جا سکتا ہے۔ دُنیا کی دولت کی تاریخ میں ایک بڑا موڑ تو اُس وقت آیا تھا جس وقت ہماری دولت نے استعمالی چیزوں — جانوروں، اناج، سیپ وغیرہ — کا لباس چھوڑ کر دھاتوں — سونے، چاندی اور تانبے پیتل کا لباس پہنا تھا۔ اور اب یہ دوسرا موڑ تھا جب اس نے دھاتوں کو چھوڑ کر کاغذ کا لباس اپنایا۔

تصویر 4 : جولائی 1676 کا ایک نوٹ

(اسٹوری آف پیپر منی 'Story of Paper Money' سے شکریے کے ساتھ اخذ کی گئی)

کاغذی چکّر

اچھا اب چونکہ خود ہمارے پھندوں میں سے ایک پھندا کھُلنے والا ہے تو ذرا سا اسے غور سے دیکھیں۔

اصل میں ہوتا یہ تھا کہ جب کوئی بیوپاری یا سرمایہ دار اپنا روپیہ یا سونا چاندی کسی سُنار کے پاس جمع کرانے لاتا تھا تو سُنار اس کی ایک رسید بیوپاری کو دیتا تھا، جسے انگریزی میں 'Deposit Voucher' کہتے ہیں۔ یہ کچھ ایسی ہوتی تھی :

1۔جولائی 1676

میں ایم۔ٹامس پارسی ویل سے، یا جس کے پاس بھی یہ کاغذ ہے،

وعدہ کرتا ہوں کہ اس کے مانگنے پر یا اِس نوٹ کو پیش کرنے پر
ایک سَو پونڈ (-/100 £) ادا کر دوں گا۔

برائے سر رابرٹس کلیٹن
اور
جان مارس صاحبان
(دستخط ڈین مانٹیگو)

(1676 کے ایک نوٹ کا ترجمہ)

ٹھیک ہے بھائی پیسے کا معاملہ ہے۔ رسید دینا تو ضروری ہے۔ اب مسٹر ٹامس نے ایک سَو پونڈ کا سامان مسٹر جوزف سے خریدا اور نقد روپیے ادا کرنے کے بجائے سر کلیٹن اور مسٹر مارس سُنار کا یہ وعدہ ہی انھیں دے دیا۔ چونکہ مسٹر جوزف کو سُناروں کی اس کمپنی کا اعتبار تھا اِس لیے انھوں نے یہ کاغذ لے لیا۔ بعد میں یہ ان کے پاس گئے اور روپیہ لے آئے۔

اچھا اب ذرا اپنا دس روپیے کا یا کوئی بھی بڑا نوٹ اُٹھا کر دیکھو۔ اِس پر کیا لکھا ہے؟ اِس پر تمھیں انگریزی اور ہندی میں لکھا ہوا ملے گا:

"میں اِس نوٹ رکھنے والے کو دس روپیے دینے کا وعدہ کرتا ہوں"۔

اور پھر اس کے نیچے ہمارے مُلک کے سب سے بڑے بینک یعنی 'ریزرو بینک' کے گورنر صاحب کے دستخط ہیں۔

اب دیکھا تم نے! لگ بھگ اسی وقت سے ہمارے کاغذی نوٹ کی بُنیاد نظر آنے لگتی ہے۔

اور کبھی کبھی یہ بھی ہو جاتا تھا کہ مسٹر ٹامس جن کا روپیہ سر کلیٹن اور مارس کی کمپنی کے پاس جمع ہے، انھوں نے جب مسٹر جوزف سے پچھتّر پونڈ کا

سامان خریدا تو نقد روپیے ادا کرنے کی بجائے ایک کاغذ پر ان کے نام کچھ اِس طرح کا پرچہ لکھا :

2 ۔ اگست 1677

اِس پرچے کو لانے والے مسٹر جوزف کو یا جن صاحب کو یہ بھیجیں میرے حساب میں سے پچھتّر پونڈ (£ 75) ادا کر دیجیے۔
(دستخط ٹامس پارسی ویل)

مسٹر جوزف یہ پرچہ لے کر اس کمپنی میں گئے اور پچھتّر پونڈ لے لیے۔ سُنار روپیہ ادا کرنے سے پہلے دو باتوں کا ضرور خیال رکھتے تھے۔ پہلی یہ کہ
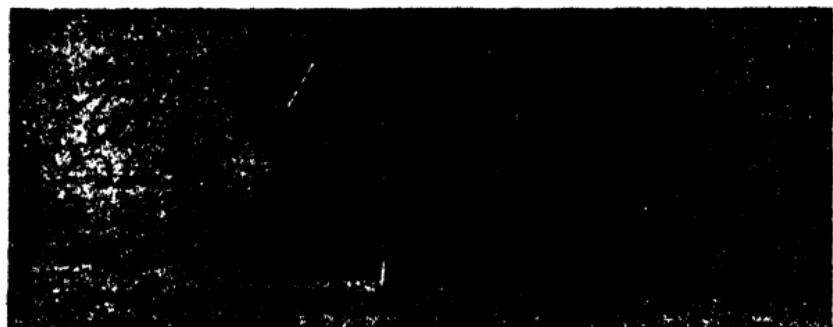
تصویر 5 : 2 اگست 1684 کا ایک اور نوٹ (انسٹی ٹیوٹ آف بینکرس، لندن کے شکریے کے ساتھ)

مسٹر ٹامس کے حساب میں اِتنی رقم ہے بھی یا نہیں، کہ پچھتّر پونڈ ادا کر دیے جائیں اور دوسری بات یہ کہ وہ مسٹر ٹامس کے دستخطوں کی خوب اچھی طرح پہچان کر لیتے تھے۔

اچھا اب اپنے ابّا یا کسی اور بُزرگ سے ان کے بینک کا کوئی چیک لے کر دیکھو، تمھیں اس میں کچھ ایسی ہی باتیں لکھی ہوئی مِلیں گی۔ فرق صرف یہ ہے کہ اب بینک نے ہی انھیں چھپوا دیا ہے اور صرف روپیوں کی تعداد اور نام کی جگہ

خالی چھوڑ دی ہے۔
توبھائی اس سے تو سُناروں کو اور بھی آسانی ہوگئی۔ کچھ دن میں یہ 'کاغذی وعدے' اسی طرح چلنے لگے جیسے سونے چاندی کے سکّے چلتے ہیں۔ چونکہ سُناروں پر اعتبار تھا اس لیے ہر شخص انھیں اپنے روپیے کی بجائے خوشی سے قبول کرلیتا تھا۔ اب جو سُناروں نے یہ دیکھا کہ جتنا روپیہ نقد رکھنے کی انھیں ضرورت پڑتی تھی، اب اُتنی بھی نہیں پڑتی، اور 'کاغذی وعدوں' سے ہی کام چل جاتا ہے، تو انھوں نے اس سے اور زیادہ فائدہ اُٹھانا شروع کر دیا۔ شروع شروع میں تو یہ سچ مچ صرف جمع کی رسیدیں یا 'ڈیپازٹ واؤچر' ہی رہے، اور ان کی ایسی شکلیں بھی نظر آئیں کہ ایک وقت کسی نے سَو پونڈ جمع کیے تو سُنار نے سَو پونڈ کا نوٹ دے دیا۔ پھر کچھ دن بعد جمع کرانے والے نے بیس پونڈ نکلوا لیے، تو اسی نوٹ میں سے بیس پونڈ گھٹا دیے گئے اور اب یہ نوٹ صرف اسّی پونڈ کا رہ گیا۔ یہ سارا حساب کتاب اسی نوٹ پر لکھ دیا جاتا تھا۔ اس وقت تک تو یہ سچ مچ جمع رقم کی رسیدیں ہی کہی جا سکتی تھیں۔ لیکن بعد میں سُناروں نے انھیں علیحدہ سے بھی چلانا شروع کر دیا۔ اب ضروری نہیں تھا کہ ہر 'کاغذی وعدہ'، جسے 'سُناری نوٹ' (Goldsmith's Note) کہا جاتا تھا، کسی کے جمع کیے ہوئے سونے کی رسید ہی ہو۔ یہ اس وقت کے سکّوں میں دس، بیس، پچاس یا سَو سکّوں کا نوٹ بھی ہو سکتا تھا۔
چنانچہ کچھ دن بعد یہ نوٹ اصلی جمع کی ہوئی رقم سے کہیں زیادہ قیمت کے بازاروں میں گھومتے ہوئے نظر آنے لگے۔
اس سلسلے کے تاریخ دانوں کا خیال ہے کہ اس قسم کے سب سے پہلے 'سُناری نوٹ'، لندن کے سُناروں کی ایک کمپنی نے 1650 اور 1675 کے

Thomas

Edmond

تصویر 6 : ایک بہت پرانا انگریزی چیک جو 14 اگست 1675 کو جاری کیا گیا۔
(انسٹی ٹیوٹ آف بینکرس، لندن کے شکریے کے ساتھ)

درمیان چلانے شروع کر دیے تھے ۔

نوٹ جاری کرنا بینک کے سب سے بڑے چند کاموں میں مانا جاتا ہے۔ اگر ذرا سا غور سے دیکھو تو تم خود ہی یہ بات کہو گے کہ اصلی سونے کے انڈے دینے والی مُرغی تو سُناروں کے ہی ہاتھ لگی تھی ۔ ان سے پہلے صرّافوں یا 'تاجر بینک کاروں' کے پاس تو شاید نقلی مُرغی تھی، یا اُس کے انڈوں کا سونا اتنا کھرا نہیں تھا۔ وہ لوگ تو صرف اُدھار کا چکّر چلاتے تھے اور یہ لوگ نوٹ چھاپ کر روپیہ پیدا کر لیتے تھے۔ اگر بازار میں ان کا اعتبار ہے اور

تصویر 7 : سویڈن کا 100 ڈالر کا ایک خوبصورت نوٹ۔ 30 جنوری 1666 کو جاری کیا گیا۔
(انسٹی ٹیوٹ آف بینکرس، لندن کے شکریے کے ساتھ)

لوگ ان کے نوٹوں کو سکّوں کی طرح قبول کر لیتے تھے تو پھر یہ جتنے بھی چاہتے نوٹ چھاپ سکتے تھے۔ بس اگر ان پر کوئی روک تھی تو وہی کہ جب کسی وجہ سے لوگ ان سے اصلی روپیہ یعنی سونے چاندی کے سکّے ایک ساتھ مانگ بیٹھتے تھے تو ان کا دیوالہ نکل جاتا تھا۔

چلو بھائی آگے بڑھیں ـــــ ان سُناروں کی کچھ کمپنیاں بہت طاقتور ہو گئیں اور ان کا کاروبار بہت پھیل گیا تو خود انگلینڈ کی حکومت نے بھی ان سے رشتہ جوڑنا شروع کر دیا اور ان کے ساتھ لین دین میں

شریک ہوگئی ۔ یہ تعلّق 1672 تک تو چلتا رہا لیکن پھر جب ان سُنار بینک کاروں کا دیوالہ نِکلنا شروع ہوا تو حکومت کو بھی نقصان ہوا اور سرمایہ داروں کو بھی ۔ اور اِس طرح ان سُنہری بینک کاروں سے بھی لوگوں کا اعتبار اُٹھتا چلا گیا ۔

تیسرا باب

نئے بینک شروعات

نیا دَور ۔ نئے ڈھنگ

لگ بھگ اِسی زمانے میں یوروپ کے ایک مُلک اِٹلی میں یہ کاروبار آج کے بینکوں سے اور بھی کچھ قریب آتا ہوا نظر آنے لگتا ہے ۔ مگر اس کو دیکھنے سے پہلے تمھیں آج کل کے کاروبار کا ایک طریقہ اور تھوڑا سا سمجھنا پڑے گا ۔

فرض کرو کہ کوئی شخص ایک بہت بڑا کارخانہ کھولنا چاہتا ہے ۔ اس کے کھولنے میں اسے پچاس لاکھ روپیے کی ضرورت ہے ۔ اب بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جو ایک ساتھ پچاس لاکھ روپیے کسی ایک کاروبار کے لیے ایک ساتھ نِکال سکیں ۔ اگر ان کے پاس اِتنا روپیہ ہوگا بھی تب بھی وہ یہ نہیں چاہیں گے کہ اپنی ساری جمع جتھا ایک نئے کاروبار میں پھنسا دیں اور اگر اس میں نقصان ہو جائے تو ان کی ساری دولت ایک دَم ختم ہو جائے ۔ تو پھر یہ لوگ کیا کرتے ہیں ؟

یہ اس کاروبار میں بہت سے لوگوں کو حِصّے دار یا شریک بنا لیتے ہیں ۔

فرض کرو کہ انھیں 50,00,000 روپیے کی ضرورت ہے۔ اب انھوں نے اس رقم کو ایک ایک ہزار روپیے کے 5000 حصّوں میں تقسیم کر دیا اور ان حصّوں کو بازار میں بیچنا شروع کر دیا۔ جو لوگ اِس کاروبار پر اعتبار رکھتے ہیں وہ اس کے جتنے حصّے چاہیں خرید لیں گے۔ اگر اس میں فائدہ ہوا تو سال کے آخر میں جتنے جس کے حصّے ہیں اُسی حساب سے منافع مِل جائے گا، اور اگر نقصان ہوا تو اسی طرح انھیں اپنے حصّوں پر نقصان اُٹھانا پڑے گا۔

یہ آج کل کے کاروبار کا ایک اور پھندا ہے جسے ہم صرف اتنا ہی ہاتھ لگائیں گے کہ اس کو اگر تم چاہو تو 'حصّے داری کا کاروبار' کہہ لو۔ انگریزی میں اِس قسم کے کاروبار کو 'لمیٹیڈ کمپنی' یا 'کارپوریشن' کہتے ہیں۔ بس اِتنا اور ذہن میں رکھ لو کہ دُنیا کے بہت سے مُلکوں میں آج کل زیادہ تر کاروبار اِسی اصول پر چلتے ہیں۔

اچھا بھائی، اب ہم پھر اپنی کہانی کے سلسلے کو آگے بڑھائیں۔

حکومتوں کو جب اُدھار کی ضرورت پڑتی ہے تو وہ کہاں سے پیسہ لاتی ہیں ــــــ؟ آج کل یا تو بینکوں سے اُدھار لیتی ہیں یا پھر عام جنتا سے ــ عام جنتا سے بھی عام طور پر بینکوں کے ذریعے ہی اُدھار لیا جاتا ہے ــــ اُدھار لینے کی ضرورت حکومتوں کو ہمیشہ ہی پیش آتی رہی ہے۔ تم پہلے بھی پڑھ چکے ہو کہ ہندوستان میں بادشاہ سیٹھوں، مہاجنوں وغیرہ سے اُدھار لیتے تھے۔ اِٹلی میں جب حکومت اُدھار لیتی تھی تو ضمانت کے طور پر کچھ محصولوں یا ٹیکسوں کی وصولی کا کام قرض دینے والوں کو ہی سونپ دیتی تھی۔

قرض کا روپیہ جمع کر کے حکومت کو پہنچانا، ٹیکسوں کی وصولی کرتے رہنا،

جو پُورے سال آہستہ آہستہ ہوتی رہتی تھی، اس پیسے کو جمع رکھنا، پھر قرض دینے والوں کو سال کے سال ان کی رقموں پر سُود دینا وغیرہ وغیرہ۔ یہ ایسے کام تھے جو ہر قرض دینے والا الگ الگ تو نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ قرض دینے والوں نے آپس میں مِل کر کچھ انجمنیں بنالیں، جن کو 'کارپوریشن' کہتے تھے۔ اب یہ کارپوریشن ہی ان سارے کاموں کو پُورا کرنے لگی۔

اب ٹیکس تو سال بھر وصول ہوتے رہتے تھے اور منافع یا سُود بٹتا تھا سال میں ایک بار یا دو بار۔ اِس لیے ان کارپوریشنوں کے پاس کافی روپیہ جمع رہتا تھا۔ چنانچہ ان کارپوریشنوں نے اپنے فالتو روپیے کو بھی اُدھار پہ چلانا شروع کر دیا۔ کبھی حکومت کو ہی ضرورت پیش آتی تھی تو وہ ان سے تھوڑے وقت کے لیے بھی اُدھار لے لیتی تھی اور کبھی کارپوریشن کے کسی ممبر کو بھی اُدھار دے دیا جاتا تھا۔

ان کے پاس روپے کو محفوظ رکھنے کے لیے بڑی بڑی مضبوط تجوریاں تھیں۔ چنانچہ خود ان کے ممبروں نے اور پھر دوسرے سرمایہ داروں اور بیوپاریوں نے بھی اپنا روپیہ ان کے پاس جمع کرانا شروع کر دیا۔ پھر جب یہ سارے کام ہونے لگے تو کھاتوں میں بھی روپیہ ایک نام سے دوسرے نام پر تبدیل ہونے لگا۔ اور آہستہ آہستہ وہ سارے کام جو بینک کرتا ہے ان کارپوریشن بینکوں' میں بھی شروع ہو گئے۔

بلکہ ایک طرح تو یہ اب سے پہلے تمام بینکوں یا روپے پیسے کے کاروبار کرنے والوں سے آگے تھے۔ اب تک یہ کاروبار عام طور پر کسی ایک ہی شخص کا ہوتا تھا، نفع بھی اس کا اور نقصان بھی اس کا۔ مگر ان کارپوریشنوں کا کوئی ایک شخص مالک نہیں تھا۔ بہت سے لوگ ایک ساتھ مالک تھے۔ اور یہ وہ

اصول تھے جن پر آج تک بھی بہت سے بینک قایم ہیں۔

سترھویں صدی میں یوروپ میں تجارت اور بیوپار کا بڑا زور تھا۔ بڑی بڑی کمپنیاں تھیں، دوسرے ملکوں کو مال جاتا تھا۔ پھر یہ مال اسی وقت تو جا سکتا تھا جب خوب پیدا ہو رہا ہو۔ اِس لیے کارخانے کھُل رہے تھے، نئی نئی ایجادیں ہو رہی تھیں۔ یوروپ کے ملک ایشیا اور افریقہ میں نئے نئے ملک فتح کر کے وہاں اپنا مال بیچ رہے تھے۔ اور ان سب کاموں میں پیسے کی زبردست ضرورت تھی۔

پیسہ یا سرمایہ پیدا کرنے کی ترکیب بھی ایجاد ہو چکی تھی، جسے تم صرّافوں، 'تاجر بینک کاروں' اور سناروں وغیرہ کے زمانے میں دیکھ ہی چکے ہو۔ اور ایسی صورت میں یہ بات مشکل تھی کہ کسی ادارے کے پاس بہت سا روپیہ رکھا ہوا ہو اور وہ استعمال نہ کیا جائے۔ چنانچہ شروع میں تو خود شہر کی میونسپلٹیوں اور حکومتوں نے ان نئے کارپوریشن بینکوں سے روپیہ اُدھار لینا شروع کیا اور پھر بعد میں کارپوریشن بینکوں نے خود ہی بڑی بڑی تجارتی اور کاروباری کمپنیوں کو اُدھار دینا شروع کر دیا۔

تو ہم نے یہ دیکھا کہ سترھویں صدی میں اور اٹھارھویں صدی کے شروع تک وہ سارے اصول اور بنیادیں پکّی ہو چکی تھیں جن پر آج کا بینک کام کرتا ہے — روپیہ جمع ہوتا تھا، اُدھار دیا جاتا تھا، نقد روپیہ دیے بغیر ہی کھاتوں کے ذریعے ایک سے دوسرے آدمی کو ادائیگی بھی ہو جاتی تھی۔ صرف کاغذ پر لکھ کر دینے سے ہی (جسے تم آج کی زبان میں 'چیک' کہتے ہو) ادائیگی ہو سکتی تھی اور روپیہ لینے والا نقد روپیہ نہیں مانگتا تھا — کاغذ کے نوٹ کو لوگ روپیے کی جگہ قبول کر لیتے تھے۔ بینکوں کے پٹّوں یا (Bills of Exchange)

کے ذریعے ملک کے اندر اور ملک کے باہر تجارت آسان ہوگئی تھی، اور بڑی بڑی کمپنیوں کے کاروباروں اور تجارت کی ضرورتوں کو بینک پورا کر رہے تھے۔ بس یوروپ کے ہر ملک میں میدان تیار تھا۔ چھوٹے بڑے اِدارے جنھیں 'بینک' ہی کہا جاتا تھا ـــــــ ایمسٹرڈم کا 'ویسل بینک'، اِٹلی میں نیپلس شہر کا 'Fedi di Credito'، شمالی اِٹلی میں جینوا (Genoa) شہر کا 'Casa di San Giorgio' اور سویڈن کا 'Stockholm Banco' وغیرہ پہلے سے ہی کام میں لگے ہوئے تھے۔ بس اب وقت آگیا تھا کہ بینک کا کاروبار بالکل باقاعدہ اور نئے ڈھنگ سے شروع ہو جائے۔

نیا بینک

ابھی تھوڑی دیر پہلے تم اِٹلی کی کارپوریشنوں کے بارے میں پڑھ چکے ہو۔ حکومت کو قرض دینے والوں نے مل کر ایک کارپوریشن بنالی تھی۔ جس نے بعد میں بینک کا کاروبار شروع کر دیا۔ اب ہر جگہ کی حکومتوں کو قرض کی ضرورت پیش آتی رہتی ہے۔ جب سترھویں صدی کے آخری سالوں میں انگلینڈ کی حکومت کو قرض کی ضرورت پیش آئی تو اس نے انگلینڈ کے لوگوں سے قرض مانگا۔

پھر حکومت کی اجازت اور مدد سے ہی قرض کے معاملات کو باقاعدگی سے چلاتے رکھنے کے لیے قرض دینے والوں نے ایک کارپوریشن بنالی، جسے 1694 میں حکومت نے پوری طرح منظوری یا 'چارٹر' دے دیا۔ اس کمپنی کا نام تھا 'انگلینڈ بینک ـــــــ کی انتظامیہ کمیٹی' (The Governer and Company of Bank of England) لیکن بعد میں یہ صرف 'بینک آف انگلینڈ'

کے نام سے ہی مشہور ہوئی ۔ انگلینڈ کی حکومت نے اسے وہ سارے کام سونپ
دیے تھے جو آج کے بینک کسی نہ کسی روپ میں ہمیں کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔
یہ بینک سونے کی خرید و فروخت کا کام کرتا تھا۔ تجارتی ہنڈیوں یعنی
'بل آف ایکسچینج' کا کاروبار کرتا تھا، ضمانتیں لے کر بیوپاریوں اور کاروبار
کرنے والے لوگوں، کارخانوں، کمپنیوں وغیرہ کو سرمایہ قرض دیتا تھا۔ اس
بینک کو خود اپنا کاروبار کرنے کے لیے بھی سرمایہ اُدھار لینے کی اجازت
دی گئی تھی۔ اپنے پاس جمع سونے اور ایسی ضمانتوں کی قیمت کے برابر،
جنھیں آسانی سے بازار میں بیچ کر نقد روپیہ حاصل کیا جاسکے، بینک نوٹ
جاری کرنے کی بھی اسے اجازت تھی ۔ غرض یہ ہر طرح سے ایک نیا اور مکمل
بینک تھا۔

'بینک نوٹ' چلانے میں بھی 'بینک آف انگلینڈ' کو سب سے اہم اور
سب سے پُرانا بینک مانا جاتا ہے۔ ویسے سب سے پہلے جس بینک نے نوٹ
چلائے وہ تو سویڈن کا 'Stockholm Banco' تھا جس کا نام تم پہلے ہی سن
چکے ہو۔ اس نے پہلی جولائی 1661 کو ہی نوٹ چلانے شروع کر دیے تھے، لیکن
تین سال بعد ہی یہ نوٹ بند کر دیے گئے تھے۔ مگر 'بینک آف انگلینڈ' کے
قائم ہوتے ہی کاغذی نوٹ چلانے کا بھی فیصلہ کر لیا گیا اور 1697 میں اس
بینک کے نوٹ لوگوں کے ہاتھوں میں آنے لگے —— اور جب چلے تو ایسے
چلے کہ آج تک یہ بینک نوٹ چلاتا ہے۔ اسی لیے اسے کاغذی نوٹ چلانے
والا سب سے پُرانا بینک مانا جاتا ہے۔

نوٹوں کی کہانی خود ایک الگ کہانی ہے اور اتنی ہی دلچسپ ہے جتنی
سِکّوں یا ٹکٹوں کی کہانی، مگر اس وقت میں اِس کہانی کو سُنانے کا ارادہ

نہیں رکھتا۔ بعض لوگ تو پُرانے سکّوں اور ڈاک کے ٹکٹوں کی طرح نوٹ بھی جمع کرتے ہیں۔ یہ بڑا دلچسپ اور کارآمد مشغلہ ہے۔ سچ پُوچھو تو ان کے اس شوق سے ہی اس سلسلے میں بہت سی نئی نئی باتیں معلوم ہوسکی ہیں۔ خیر اس وقت تو میں پُرانے نوٹوں کے بارے میں کچھ موٹی موٹی باتیں ہی بتاؤں گا۔

شروع شروع میں تو 'بینک آف انگلینڈ' کے نوٹ بھی پُوری طرح ہاتھ کے لکھے ہوئے ہی ہوتے تھے اور ان پر لگ بھگ ویسی ہی عبارت لکھی ہوتی تھی جیسی تم پہلے بھی پڑھ چکے ہو۔ ضروری نہیں تھا کہ یہ پُوری پُوری رقموں کے ـــــ یعنی ایک پونڈ، پانچ پونڈ، دس پونڈ وغیرہ کے ہی ہوں ـــــ
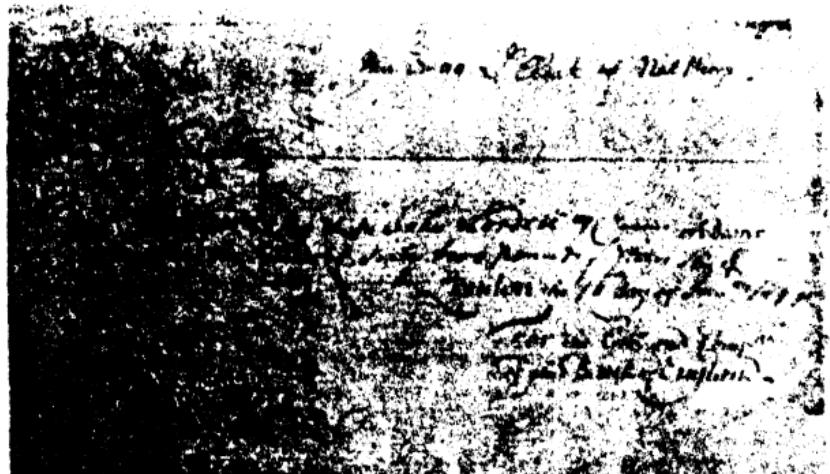
تصویر 8 : پُوری طرح ہاتھ سے لکھا ہوا 'بینک آف انگلینڈ' کا ایک نوٹ جو 22 جنوری 1699 کو جاری کیا گیا۔ شروع میں یہ 62 پونڈ 15 شلنگ کا نوٹ تھا۔ بعد میں 54 پونڈ 15 شلنگ ایک پینس ادا کر دیے گئے۔ آخر میں اس نوٹ کی قیمت 8 پونڈ ایک شلنگ 11 پینس رہ گئی۔
(بینک آف انگلینڈ کے شکریے کے ساتھ)

62 پونڈ 15 شلنگ کے بھی ہو سکتے تھے انھیں نقد کی رسید (Cash Receipt) کہا جاتا تھا۔ جب نوٹ کا مالک کچھ رقم نکال لیتا تھا تو وہ اس میں سے گھٹا دی جاتی تھی۔ یہ نوٹ کسی ایک ہی شخص کے نام جاری کیے جاتے تھے اور نوٹ پر اُسی کا نام لکھا ہوتا تھا، لیکن اگر وہ چاہے تو کسی دوسرے کو دے سکتا تھا اور بینک اسی کو رقم دے دیتا تھا جو اس نوٹ کو بینک کے سامنے پیش کرتا تھا۔

پھر کچھ بعد میں آدھے چھپے ہوئے نوٹ چلنے شروع ہوئے، جن میں پوری عبارت اور رقم چھپی ہوئی تھی، صرف نام کی جگہ اور تاریخ کی جگہ خالی چھوڑ دی جاتی تھی۔ لیکن آخر میں اٹھارھویں صدی کے آخر تک بینک آف
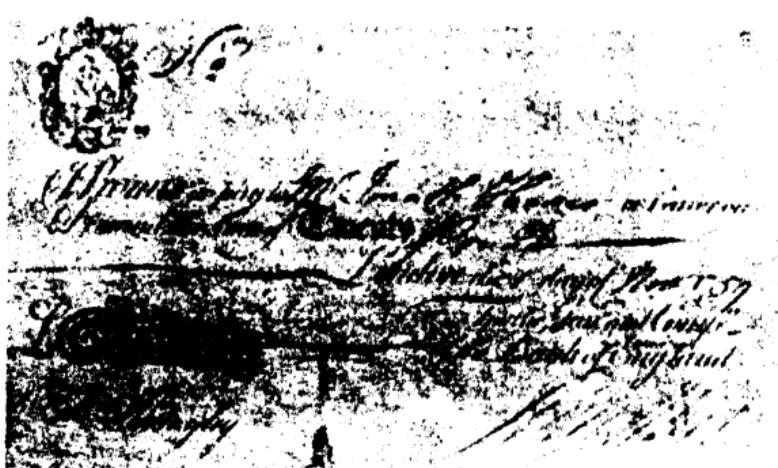
تصویر 9 : بینک آف انگلینڈ کا 20 پونڈ کا آدھا چھپا ہوا نوٹ۔ پہلی نومبر 1759
۔ صرف نام اور تاریخ ہاتھ سے لکھی گئی ہے۔
(بینک آف انگلینڈ کے شکریے کے ساتھ)

انگلینڈ نے پوری طرح چھپے ہوئے نوٹ چلانے شروع کر دیے۔ یہ پوری پوری رقموں یعنی پانچ پونڈ، دس پونڈ وغیرہ کے نوٹ ہوتے تھے اور اسی طرح لیے دیے جاتے تھے جیسے آج ہم لیتے دیتے ہیں۔

اس کے بعد سے دُنیا کے سارے بڑے بینک اپنے نوٹ چلاتے رہے مگر یہ بات ضرور یاد رکھنا کہ نوٹ رکھنے والا شخص جب چاہتا تھا اپنے نوٹ کے بدلے میں اس وقت کے اصلی سکّے یعنی سونے چاندی وغیرہ کے سکّے لے سکتا تھا۔ اور یہی وعدہ نوٹ پر لکھا بھی جاتا تھا۔

بینک آف انگلینڈ کے کھُلنے کے وقت سے بینک کی کہانی کا لگ بھگ وہی دور شروع ہو جاتا ہے جس سے ہم گزر رہے ہیں۔ اس کے بعد ترقّیاں بھی ہوئیں اور چھوٹی موٹی تبدیلیاں بھی آئیں اور کبھی کبھی کچھ اہم تبدیلیاں بھی نظر آئیں۔ مگر بینک کے کاروبار کی بُنیاد یا اس کے اصول وہی رہے۔

ہمارے بینک کیا کرتے ہیں؟

تم کبھی کسی بینک میں اندر گئے ہو ــــــ؟ آؤ کسی بینک میں چلیں اور ذرا موٹے موٹے طور پر یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ آج کل یہاں کیا کام ہوتا ہے اور کس طرح ہوتا ہے؟

باہر کے دروازے پر ایک چوکیدار بندوق لیے اور کارتوسوں کی پیٹی لگائے کھڑا ہے۔ ٹھیک ہے بھائی روپے پیسے کا معاملہ ہے، اس کی حفاظت بھی ضروری ہے۔ اور تم پہلے ہی سُن چکے ہو کہ بینکوں کا کام شروع کرنے کے لیے جن چیزوں نے سب سے زیادہ انسان کو اُکسایا تھا ان میں سے اپنے روپیے کی حفاظت بھی بہت اہم خیال تھا۔

لو بھائی! تم ایک بہت بڑے ہال میں کھڑے ہوئے ہو، جس میں بڑی چہل پہل اور رونق ہے۔ اس میں ایک بہت چمک دار جنگلہ یا کاؤنٹر بنا ہوا ہے۔ بہت سی کھڑکیاں ہیں جن کے پیچھے کچھ بابو بیٹھے ہوئے کام کر رہے ہیں — کوئی لوگوں کا روپیہ جمع کر رہا ہے، کوئی بڑے بڑے کھاتے دیکھ رہا ہے، کوئی کاغذ پر بہت تیزی سے جوڑنے گھٹانے کے کام میں مصروف ہے اور کوئی چیک لانے والے لوگوں کو گن کر پیسے دے رہا ہے۔ یہ روپیے ان لوگوں نے اپنے حساب میں پہلے سے جمع کروا رکھے ہیں اور جب جب انھیں ضرورت ہوتی ہے یا تو خود آکر یا کسی اور کے ہاتھ چیک بھیج کر روپیہ نکلوا لیتے ہیں۔ اگر انھیں روپیہ کسی اور کو ادا کرنا ہوتا ہے تو اسے چیک ہی دے دیتے ہیں وہ خود آکر روپیہ نکلوا لیتا ہے۔

اور تم یہ جانتے ہی ہو کہ بینک کے کاموں میں سے یہ شاید سب سے پہلا کام ہے — لوگوں کا روپیہ جمع رکھنا اور جب بھی انھیں ضرورت ہو تو خود انھیں یا جسے یہ چاہیں اُسے روپیہ دے دینا۔ اس کا صحیح صحیح حساب رکھنا۔

پھر ظاہر ہے کہ لوگ روپیہ جمع کرانے بھی آتے ہیں۔ ان کے لیے الگ کھڑکیاں ہیں۔ ایک چھوٹے سے فارم پر جتنا روپیہ جمع کرانا ہے، جس کھاتے میں جمع کرانا ہے اس کا نمبر، اپنا نام، نقد جمع کرانا ہے یا چیک کے ذریعے وغیرہ وغیرہ یہ سب چیزیں لکھیں، روپیہ اور فارم کھڑکی پر دے دیا۔ کھڑکی پر دوسری طرف بیٹھے بابو جی نے روپیہ گنا، یا جمع کیے جانے والے چیک کو غور سے دیکھا، فارم کو دیکھا کہ ہر چیز ٹھیک ٹھیک لکھی گئی ہے یا نہیں، دستخط کیے اور اپنے کھاتے میں چڑھا لیا۔ فارم پر مُہر لگائی اور رسید دے دی۔ اب ذرا دیکھو کہ چیک کے ذریعے روپیے کیسے جمع ہوتے ہیں۔

فرض کرو روشن صاحب کو پانچ سَو روپیے اپنے دوست راجندر صاحب کو ادا کرنے ہیں۔ دونوں کا حساب اسی بینک میں چلتا ہے۔ روشن صاحب نے ایک چیک راجندر صاحب کے نام کاٹ دیا اور راجندر صاحب نے اسے بینک میں جمع کرا دیا۔ پانچ سَو روپیے روشن صاحب کے حساب میں کم کر دیے گئے اور راجندر صاحب کے حساب میں بڑھا دیے گئے۔ لیجیے صاحب ہوگئی ادائیگی۔ اِس کام کے بارے میں بھی تم جانتے ہو کہ یہ بینکوں کا بہت پُرانا کام ہے ـــــ یعنی ایک کھاتے سے دوسرے کھاتے میں رقمیں منتقل کرنا۔ اور پھر صرف اسی بینک میں نہیں، روشن صاحب کا حساب ہندوستان بھر میں کسی بینک میں بھی چلتا ہو وہ راجندر صاحب کو اپنے ہی بینک کا چیک دے دیں گے۔ راجندر صاحب اسے اپنے بینک میں جمع کرا دیں گے۔

روشن صاحب ایک چیک جیسی ہی چیز 'ڈیمانڈ ڈرافٹ (Demand Draft) بھی راجندر صاحب کو بھیج سکتے ہیں۔ 'ڈیمانڈ ڈرافٹ' میں پیسہ یا تو نقد ادا کر دیا جاتا ہے یا اگر حساب میں سے بھی گھٹانا ہو تو پہلے ہی گھٹا کر اس ڈرافٹ پر ہی لکھ دیا جاتا ہے کہ 'رقم پہلے ادا کر دی گئی ہے'۔ جس کو یہ ڈرافٹ ملتا ہے اُسے دوسرے بینک سے ادائیگی کا انتظار نہیں کرنا پڑتا۔ دونوں بینک بعد میں کسی وقت چیکوں اور ڈرافٹوں کی بیباقی کا کام کر لیتے ہیں۔

پیسے کا یہ لین دین کارخانے کے مالکوں، تاجروں، بیوپاریوں، دُکان داروں، حکومت کے دفتروں اور شعبوں، ریاستی حکومتوں، افسروں غرض ہر قسم کے لوگوں اور اداروں کے درمیان ہوتا رہتا ہے، اور بینک ان سب کے لیے کام کرتا ہے۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ کسی بھی بینک میں روزانہ بہت سے لوگ اپنا روپیہ جمع کروانے آتے ہیں اور بہت سے لوگ اپنا

روپیہ نکلوانے آتے ہیں۔ اور یہ ایک ایسا چکّر ہے جو روزانہ صبح سے شام تک چلتا رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بینک کا سب سے اہم کام ہے اور ایک عام آدمی بینک کے کاروبار کو اتنا ہی جانتا بھی ہے۔ بس اِس سلسلے میں جو چیز خاص طور پر جاننا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ لوگ جو روپیہ جمع کرواتے ہیں اس کا حساب یا کھاتہ کسی قِسم کا ہوتا ہے۔

پہلا تو وہی ہے جِس میں جب چاہیے روپیہ جمع کروائیے اور چیک دے کر جب چاہیے نِکال لیجیے۔ اِسے آپ چاہیں تو 'عارضی کھاتہ' یا 'فوری کھاتہ' کہہ سکتے ہیں۔ انگریزی میں اسے ' Demand Deposit ' کہتے ہیں۔ اِس پر اب تھوڑا بہت سُود بھی مِلنے لگا ہے۔

دوسرا سب سے اہم کھاتہ یا حساب ہوتا ہے جس میں آپ ایک مقرّرہ مُدّت کے لیے روپیہ جمع کرواتے ہیں —— چھ مہینے، سال بھر یا اِس سے بھی زیادہ مُدّت کے لیے۔ اِس میں سے آپ جب چاہیں روپیہ نہیں نِکلوا سکتے۔ یہ روپیہ صرف مقرّرہ مُدّت ختم ہونے کے بعد ہی مِل سکتا ہے۔ اِس پر نسبتاً زیادہ سُود مِلتا ہے۔ اگر آپ کو کِسی وقت کچھ روپیے کی بہت سخت ضرورت پیش آئے تو آپ اس جمع کھاتے کی ضمانت پر اُدھار لے سکتے ہیں، جس پر خود آپ کو ہی سُود دینا ہوتا ہے۔ اِس کھاتے کو انگریزی میں ' Time Deposit ' کہتے ہیں۔ اِسی 'میعادی' کھاتے میں ایک قِسم کا کھاتہ وہ بھی ہوتا ہے جِس میں آپ ساری رقم ایک ساتھ جمع نہیں کر دیتے، بلکہ تھوڑی تھوڑی کر کے ایک مقرّرہ مُدّت یعنی پانچ سال یا دس سال میں یہ رقم جمع کرواتے ہیں۔ اِسے انگریزی میں ' Recurring Deposit ' کہتے ہیں۔ اِس پر بھی بینک سُود دیتا ہے۔

بینک میں جمع ہونے والے روپیے کے کھاتوں کی یہی بہت خاص قسمیں ہیں۔ اِن کے علاوہ بینک اپنے کاموں میں دلچسپی پیدا کرنے کے لیے بچت کے کتنے ہی چھوٹے چھوٹے طریقے چلاتے ہیں تاکہ صرف پیسے والے لوگ ہی نہیں، بہت تھوڑی آمدنی والے لوگ بھی ان کے ذریعے کچھ بچت کر سکیں۔ اب تو ہمارے مُلک کے کچھ بینک بچّوں تک کو یہ آسانی دینے لگے ہیں کہ وہ اپنی گولکیں بچّوں کے پاس چھوڑ جاتے ہیں اور بچّے روزانہ، یا جب بھی کبھی ان کے پاس پیسے ہوں ان میں ڈالتے رہتے ہیں۔ ہر ہفتے یا پندرہ دن میں بینک کا ایک ملازم آتا ہے، جتنے پیسے جمع ہوں ان کی رسید دے کر بینک لے جاتا ہے اور بچّوں کے کھاتے میں جمع کر دیتا ہے۔

اور جس کاغذ کے ذریعے بینک سے روپیہ نکلوایا جاتا ہے، جسے چیک کہتے ہیں، وہ بھی کئی قسم کا ہوتا ہے۔

پہلا اور سیدھا سادا طریقہ تو یہ ہے کہ آپ خود اپنے ہی نام ایک چیک کاٹ لیں اور بینک جا کر خود ہی روپیہ لے لیں۔ اِسے 'کھُلا' (Open) چیک کہتے ہیں۔ اِسی کھُلے چیک میں آپ کسی دوسرے کا نام لکھ دیں تو اُسے یہ روپیہ نقد مل جاتا ہے۔ اگر کسی کا نام بھی نہ لکھا جائے تو جو شخص بھی اس چیک کو بینک میں لے جائے گا اسے ہی روپیہ مل جائے گا۔ اس چیک کو انگریزی میں 'Bearer' چیک کہتے ہیں۔

فرض کیجیے آپ چاہتے ہیں کہ جسے روپیہ ادا کیا جانا ہے بینک اُسے روپیہ نقد نہ دے بلکہ اُس کے حساب میں ہی جمع ہو تو آپ چیک پر اُس کا نام لکھ دیں گے اور چیک کے بائیں طرف اوپر کے کونے میں دو لائنیں کھینچ دیں گے اور لکھ دیں گے 'صرف کھاتے میں' (Payee's Account) اِس قسم کے

چیک کو 'کراس چیک' (Cross) کہتے ہیں۔ یہ رقم کی ادائیگی کا بڑا محفوظ طریقہ بھی ہے اور پکا ثبوت بھی۔ پھر اگر اسی 'کراس چیک' میں 'صرف کھاتے میں' الفاظ نہ لکھے جائیں تو یہ چیک لینے والا اپنے دستخط کر کے کسی دوسرے کے حساب میں بھی جمع کروا سکتا ہے۔

اچھا، تو یہ تو ہوا بینک کا سب سے پہلا بڑا کام، یعنی لوگوں کے روپیے کی حفاظت کرنا اور جب انھیں ضرورت ہو تو انھیں روپیہ دینا۔ اس کا دوسرا بڑا اور بہت پُرانا کام ہے اُدھار دینا۔

مگر تم جانو یہ اُدھار دینے کا کام اِتنا آسان یا ایسا سیدھا تو نہیں ہے کہ جو بھی چاہے چلا جائے اور اُدھار مانگ لائے۔ بینک اصل میں اُنہی لوگوں کو اُدھار دیتا ہے جن کے متعلق اسے یقین ہو جاتا ہے کہ وہ ساری رقم مع سُود کے واپس کر دیں گے اور دوسری بات یہ کہ وہ اسے بیکار کے کاموں میں خرچ نہیں کریں گے۔ عام طور پر بینک کسی بیوپار، تجارت، کارخانے یا کسی ایسے ہی نئے یا پُرانے کاروباری منصوبے میں لگانے کے لیے روپیہ اُدھار دیتے ہیں۔

فرض کرو ایک آدمی کسی بینک کے پاس پہنچا۔ اس نے ایک کارخانہ کھولنے کا منصوبہ بنایا ہے جس میں وہ پلاسٹک کے کھلونے اور برتن بنانا چاہتا ہے۔ بینک پہلے اس سے اس کے منصوبے کی پُوری تفصیل معلوم کرے گا، پہلے یہ یقین کر لے گا کہ اِس آدمی میں اِس کام کو پُورا کرنے کی صلاحیت ہے بھی یا نہیں۔ پھر کچھ ضمانت لے کر ایک مقرّرہ سُود پر روپیہ دے دے گا۔ اور یہ روپیہ بھی نقد نہیں دیا جاتا بلکہ اس کا ایک کھاتہ اس رقم سے بینک میں کھول دیا جاتا ہے۔ اب اس شخص کو اجازت ہوتی ہے کہ

جب جتنی ضرورت ہو روپیہ نکلوالے۔ یہ ضمانت جو بینک قبول کرتا ہے، سونا، چاندی، زیور، مکان، یا کوئی اور قیمتی چیز ہو سکتی ہے۔ اس اُدھار سے جو سُود آتا ہے وہ بینک کی آمدنی ہوتی ہے۔

پھر کبھی کبھی بینک اپنے کسی گاہک کو اس کی ضرورت کے وقت اپنی جمع کی ہوئی رقم سے زیادہ روپیہ نکلوانے کی اجازت بھی دے دیتا ہے۔ تم خود کہوگے کہ یہ بھی ایک طرح کا اُدھار ہی ہوا۔ اِس پر بینک سُود لیتا ہے۔ اِس طریقے کو انگریزی میں ' Over draft ' کہتے ہیں۔

اور اب چند سال سے تو ہمارے مُلک کے بینکوں نے بہت چھوٹے چھوٹے کاروبار کرنے والوں کو بھی اُدھار دینا شروع کر دیا ہے۔ جیسے رکشہ، اسکوٹر، ٹیکسی چلانے والوں کو بہت سے بینک معمولی سی ضمانت پر ہی اُدھار دے دیتے ہیں۔ کسانوں کو بَیل، بیج، کھاد وغیرہ خریدنے کے لیے بھی اُدھار مِل جاتا ہے۔ حد ہے کہ بعض اچھّے طالب عِلموں تک کو اعلیٰ تعلیم حاصِل کرنے کے لیے بینک اُدھار دینے لگے ہیں۔

یہاں پھر میں ایک بار تمھیں وہی دلچسپ بات یاد دلا دوں جو تم نے کچھ دیر پہلے صرّافوں اور بیوپاری بینک کاروں کے کاروبار میں دیکھی تھی۔ یعنی صرّاف نے کاروبار تو شروع کیا تھا اپنے پانچ ہزار روپیے سے، اور پانچ ہزار دوسرے لوگوں کے اس کے پاس جمع ہوئے تھے، اور یہ چکّر اتنا بڑھ گیا تھا کہ تھوڑے ہی عرصے میں اس کے لگ بھگ اٹھارہ ہزار روپیے تو اُدھار پر اُٹھ چکے تھے اور کوئی ساڑھے چار ہزار روپیے تجوری میں موجود تھے۔ اب تم خود سوچو جب کسی مُلک میں اسی اصول پر سیکڑوں بینک کام کر رہے ہوں تو کیا نتیجہ ہوگا۔ اسے تم آسان سی زبان میں اِس طرح سمجھ

سکتے ہو کہ کسی مُلک میں سارے سِکّے یا جنھیں تم روپیے کہتے ہو، جِتنے چَھپتے ہیں اُن کا کاروبار یا اُدھار کا پھیلاؤ، بلکہ وہ چکّر جو تم اِس سے پہلی مثال میں دیکھ چکے ہو، ان سے کئی گُنا زیادہ ہو جاتا ہے۔

خیر بھائی، یہ تو ہوئے بینک کے سب سے بڑے دو کام —— یعنی روپیہ جمع رکھنا اور پھر اُدھار دینا۔ لیکن اِن کے علاوہ بھی بینک کچھ چھوٹے چھوٹے کام انجام دیتا ہے، جیسے کسی ایک جگہ سے روپیہ دوسری جگہ بھیجنا ہو تو ہم بینک کے ذریعے بھیج دیتے ہیں —— چیک کے ذریعے بھی اور ڈرافٹ کے ذریعے بھی۔ ان دونوں طریقوں کو تم پہلے ہی دیکھ چکے ہو۔ پھر اپنی قیمتی چیزیں —— زیور، ہیرے جواہرات، کاغذات یا جو کچھ بھی ہم چاہیں بینکوں میں جمع کرا سکتے ہیں۔ تمھارے اسکول کی فیسیں، مکان کا کِرایہ، اُدھار خریدی ہوئی کار، اسکوٹر، ٹیلی ویژن وغیرہ کی قِسط، بیمے کی قسطوں کی ادائیگی، یہ سارے کام ہمارے بتائے ہوئے مقررہ وقت پر بینک سے ہی ہو سکتے ہیں، اور ایسے ہی بہت سے چھوٹے موٹے کاموں میں بینک ہماری مدد کرتے ہیں۔

یوروپ اور امریکہ میں تو یہاں تک انتظام ہے کہ آپ رات کو کسی بھی وقت اپنا پیسہ یا کوئی بھی قیمتی چیز بینک میں جمع کروا سکتے ہیں، صبح کو آپ چاہیں تو واپس لے لیں یا پھر با قاعدہ طور پر اپنے حساب میں ہی جمع کرا دیں۔

ایک اور بہت اچّھا کام بھی بینک ہم لوگوں کے لیے کرتا ہے۔ فرض کرو کہ تمھیں کہیں سفر پر جانا ہے۔ حفاظت کے خیال سے تم چاہتے ہو کہ بہت سا روپیہ اپنے ساتھ لے کر نہ جاؤ۔ بس تمھیں کرنا یہ ہوگا کہ تم اپنے بینک کے پاس جاؤ، انھیں روپیہ دو، وہ تمھیں کچھ چیک دیں گے، صرف تم ہی جہاں

جا رہے ہو وہاں اس بینک کی کسی شاخ میں اس چیک پر دستخط کرکے روپے لے سکتے ہو۔ انھیں Traveler cheque کہتے ہیں۔

بچّوں کی سالگرہ، کسی خوشی یا شادی وغیرہ کے موقعوں پر دینے کے لیے، خاص طور پر بہت خوبصورت چھپے ہوئے چیک بھی ملتے ہیں، جن کے ذریعے پیسہ تو مل ہی سکتا ہے، یہ دیکھنے میں بھی بہت اچھے لگتے ہیں۔

اب دیکھا تم نے کہ یہ بینک ہمارے کتنا کام آتا ہے!؟

مُلک کی ساری معاشیات، کاروبار، لین دین، بیوپار، کارخانے، غرض روپے پیسے کا ہر کام بینکوں کے ذریعے ہی ہوتا ہے۔ مُلک کی تجارت۔۔ خود مُلک کے اندر بھی اور مُلک کے باہر دوسرے ملکوں سے بھی —— اِنہی کے ذریعے ہوتی ہے۔ دوسرے مُلکوں سے روپیے کا لین دین، حساب کتاب اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ اپنے مُلک کے روپیے کے بدلے میں کسی دوسرے مُلک کا کتنا روپیہ لیا دیا جائے، یہ سب کچھ بھی بینک کے ذریعے ہی طے ہوتا ہے۔

لیکن عام آدمی، بلکہ یوں کہوں کہ ہمارے مُلک کے معمولی آدمی کی زندگی میں اِس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اگر اُسے اپنا روپیہ بینک میں رکھنے کی عادت ہو جائے تو وہ صرف چوروں اور لٹیروں سے ہی محفوظ نہیں رہتا بلکہ اِس طرح سے اُسے کچھ تھوڑی بہت بچت کرنے کا موقع بھی مِل سکتا ہے۔

اب شاید ہی کوئی آدمی ایسا مِلے جو اِس دُنیا میں رہتا ہو، اس کے کاروبار اور پیسے کے لین دین میں حِصّہ لیتا ہو اور وہ بچت کے فائدوں سے اِنکار کرے۔ لیکن یہ بات بھی صحیح ہے کہ غریب آدمی کے لیے بچت کرنا

بہت مشکل کام ہے۔ اور اگر اتّفاق سے فرض کرو کہ زندگی بھر تکلیفیں اُٹھاکر ہزار پانچ سَو روپیے کسی طرح جمع بھی کرلے تو ان کے چوری ہوجانے کا خطرہ، کھوجانے کا خطرہ، بیکار کے کاموں میں خرچ ہوجانے کی پریشانی وغیرہ۔

اور پھر فرض کرو کہ کچھ ترکیبوں سے تمھارا بچایا ہوا پیسہ ان پریشانیوں اور جھنجھٹوں سے بچا بھی رہا اور کسی کاروبار میں نہ لگا تو اِس بچت سے کیا فائدہ ہوا۔ اچّھا بلکہ ضروری تو یہی ہے کہ یہ پیسہ کسی کاروبار میں لگے اور آگے کے لیے پیداوار میں کام آئے جس سے تمھیں بھی فائدہ ہو اور تمھارے مُلک کو بھی۔

یہ تو تم نے سُن ہی لیا ہے کہ آج کی دُنیا کے کاروباروں میں جِتنا سرمایہ یا روپیہ لگایا جاتا ہے وہ زیادہ تر اُدھار لے کر ہی لگایا جاتا ہے، اور شاید تم یہ بھی مان لوگے کہ ہر شخص اگر تجارت یا کاروبار کرنے لگے اور اپنا بچایا ہوا روپیہ کسی نئے کاروبار میں لگانے کا ارادہ کرلے تو ضروری نہیں کہ وہ ہر صورت میں نفع ہی کمالے گا۔ تجربے اور معلومات کی کمی کی وجہ سے نقصان اُٹھانے کا خطرہ بہت زیادہ ہے۔ یہ کام تو اس میدان کے لوگ ہی کرسکتے ہیں۔

اب ممکن ہے کہ تم خود ہی یہ بات کہنے لگو کہ ہماری چھوٹی موٹی بچتوں کو اگر بینک ہی کاروباروں اور تجارت وغیرہ کے لیے اُدھار دے کر اس سے نفع کمائیں اور اس نفع میں سے ہمارا حِصّہ ہمیں دے دیں تو یہ سب سے آسان طریقہ ہوگا۔ چونکہ بینک تو اسی اصول پر کام کرتے ہیں۔ جو پیسہ بھی ان کے پاس جمع ہوتا ہے وہ اسے مختلف کاروباروں، بیوپاروں اور تجارت وغیرہ کے لیے اُدھار دے دیتے ہیں۔ اور اِسی وجہ سے وہ ہر جمع کرانے

والے کو منافع بھی بانٹ دیتے ہیں۔

اب تم ذرا خود سوچو کہ اگر ہندوستان کی ساٹھ کروڑ آبادی کا ہر شخص اپنی آمدنی میں سے سال بھر میں صرف بیس روپیے، یعنی لگ بھگ پانچ پیسے روز جمع کرنے کی عادت ڈال لے اور انھیں بینک میں جمع کروا دے تو سال بھر میں 12 ارب روپیے بینک میں پہنچیں گے اور پھر ان کا پھیلاؤ کتنا ہوگا؟ اس سے نئے نئے کارخانے کھلیں گے، کاروبار شروع ہوگا، اور نتیجے میں لوگوں کو روزگار ملے گا اور ہمارے مُلک میں خوشحالی بڑھے گی۔

تو بھائی یہ تھے بینک کے فائدے۔

اب ہم اگر اپنی کہانی پھر شروع کریں تو دیکھیں گے کہ ہم وہاں تک تو پہنچ چکے ہیں کہ دُنیا میں نئے بینک کھلنے کا دَور شروع ہوگیا ہے۔ بینک کے کاروبار کے لگ بھگ سارے اصول بن چکے ہیں، یوروپ کے مُلکوں میں بڑے بڑے بینک قایم ہوچکے ہیں۔ بس اب ہم دو باتیں اور دیکھنے کی کوشش کریں گے۔ ان میں پہلی چیز یہ ہوگی کہ ہمارے مُلک میں یہ نئے بینک کیسے اور کب کھلنے شروع ہوئے۔

ہمارے مُلک کے نئے بینک

اب تک ہم نے یہ دیکھا تھا کہ حالانکہ ہمارے مُلک میں روپیے کے لین دین کا کاروبار تو نہ معلوم کتنے ہزار سال سے ہوتا آیا تھا اور اس میں بینک کے کاروبار کے کچھ اصول بھی کبھی کبھی اپنائے گئے تھے لیکن تھا یہ زیادہ تر صرف مہاجنی کاروبار۔ مطلب یہ کہ پیسے والا کوئی ایک شخص، بنیا، سُنار، مہاجن، ساہوکار، سیٹھ، یا جو کچھ بھی اس کا نام ہو، صرف اپنے ہی پیسے کو اُدھار پر

چلاتا تھا، سُود لیتا تھا۔ عام طور پر یہ قرض لوگوں کی گھریلو ضرورتوں، شادی بیاہ، موت یا ایسے ہی کاموں کے لیے دیا جاتا تھا۔ مگر کبھی کبھی کاروبار کے لیے بھی یہ مہاجن اور ساہوکار روپیہ دے دیتے تھے۔ تجارت میں البتّہ ان کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ چونکہ ان ساہوکاروں کا تجارتی یا بیوپاری کاروبار بھی عام طور پر چلتا رہتا تھا۔ انہی مہاجنوں اور سیٹھوں کی ایجاد کی ہوئی 'ہُنڈی' صدیوں سے مُلک کی تجارت میں وہی کام دیتی رہی تھی جو آج کل 'بِل آف ایکسچینج' انجام دیتا ہے۔

لیکن اگر سچ پُوچھو تو ان کے ہاتھ وہ سونے کے انڈے دینے والی مُرغی نہیں آئی تھی جو بارھویں تیرھویں صدی میں یوروپ کے صرّافوں اور بیوپاری بینک کاروں اور پھر ان کے بعد سُناروں کے ہاتھ لگ گئی تھی۔ ہمارے مہاجن اپنے لمبے لمبے بہی کھاتوں کے ذریعے سُود در سُود لگا کر ایک ہی آدمی بلکہ اس کے بیٹے پوتوں سے تو کئی کئی گُنا روپیہ وصول کر سکتے تھے اور اسی لیے ایک کہاوت مشہور تھی کہ سُود گھوڑے سے زیادہ تیز دوڑتا ہے، مگر ان کے ہاتھ وہ گُر یا فارمولا نہیں آیا تھا کہ روپیہ خود بخود دو گُنا اور چوگُنا کیسے ہوتا چلا جاتا ہے۔

انھوں نے دوسروں کا روپیہ جمع کر کے اسے اُدھار پر اُٹھانا یا تو بالکل سیکھا ہی نہیں تھا یا اگر سیکھا بھی تھا تو وہ اس طریقے کو کسی بڑے پیمانے پر نہیں اپناتے تھے۔ اور تم جانتے ہی ہو کہ یہ کسی نئے بینک کا پہلا اصول ہے۔ پھر انھوں نے کھاتوں ہی کھاتوں میں ایک نام سے دوسرے نام پر لین دین کے اس طریقے کو بھی عام طور پر نہیں اپنایا تھا جس میں رقم دینے والا اور رقم لینے والا دونوں مطمئن بھی ہو جاتے ہیں اور اصل رقم سیٹھ جی کی تجوری

میں ہی رکھی رہتی ہے، بلکہ اس کا زیادہ بڑا حصّہ کسی اور کو اُدھار دے دیا جاتا ہے۔ اور یہ بینک کا دوسرا بڑا اصول ہے۔

اور پھر وہ کام جو یوروپ کے سُناروں اور یوروپ کے بینکوں نے کیا — یعنی سونا چاندی اور اس کے سکّے تو تجوری میں رہے اور اس کے کاغذی وعدے لوگوں کی جیبوں میں پہنچ گئے — یہ تو اب سے سَو ڈیڑھ سَو سال پہلے ہمارے مُلک میں سوچا بھی نہیں گیا تھا۔

یہ صحیح ہے کہ انگریزوں کے ہندوستان میں آنے سے پہلے یہاں بینک کا وہ کاروبار جو ہم آج دیکھتے ہیں اِس طرح شروع ہی نہیں ہوا تھا۔

اصل میں بات یہ ہے کہ ہمارے مُلک میں زیادہ تر لوگ کھیتی باڑی کرتے تھے اور کھیتی باڑی بھی پُرانے اور دقیانوسی ڈھنگ سے۔ اگر کسی کے پاس ایک دو ہل اور ایک جوڑی بَیل اور زمین تھی تو وہ تھوڑے بہت پیسے مہاجن سے اُدھار لے کر اپنا کام شروع کر سکتا تھا۔

بڑے بڑے کارخانے نہیں تھے۔ چھوٹی چھوٹی دستکاریاں تھیں، جن میں لگانے کے لیے بہت زیادہ سرمایے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ کوئی خاندان اگر کوئی دستکاری شروع کرنا چاہتا تھا تو گھر کے لوگوں کی جمع پُونجی اور تھوڑا بہت مہاجن سے اُدھار لے کر کاروبار شروع کر دیتا تھا۔ اصل میں بڑے اُدھاروں کی ضرورت ہی بڑے بڑے کاروبار اور کارخانوں کے شروع کرنے اور ان کے چلانے کے لیے پیش آتی ہے۔ یوروپ میں بھی بینک کا باقاعدہ کاروبار اُسی وقت شروع ہوا جب ان کی بڑھتی ہوئی صنعت و حرفت، کارخانوں اور تجارت کو بہت سے روپیوں کی ضرورت پڑی۔

اچھّا تو اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ یہ نئے بینک ہندوستان میں کیسے کھُلے؟

تم نے اپنی تاریخ کی کتابوں میں پڑھا ہوگا کہ جب مُغل بادشاہوں کی حکومت کمزور ہوگئی تو برطانیہ کی ایک تجارتی کمپنی 'ایسٹ انڈیا کمپنی' تجارت کی غرض سے ہندوستان میں آئی، اور پھر آہستہ آہستہ یہاں حکومت جما بیٹھی۔ جب ذرا بڑے ہوکر اس تاریخ کو پڑھنے کا موقع تمھیں مِلے گا تو تم دیکھو گے کہ 'ایسٹ انڈیا کمپنی' کی حکومت ہمارے مُلک کے لیے بہت تکلیف دِہ بھی تھی اور بعض چیزوں میں اس نے مُلک کو فائدہ بھی پہنچایا۔ جیسے ڈاک کا نظام، یا بینکوں وغیرہ کا طریقہ۔ یہ سب چیزیں اسی زمانے میں ہم تک پہنچیں۔

خیر صاحب، ہمیں تو یہ دیکھنا ہے کہ ہندوستان میں بینک کا کاروبار کیسے اور کیوں شروع ہوا؟

جب 'ایسٹ انڈیا کمپنی' نے ہندوستان میں کاروبار شروع کیا تو روپے کے لین دین، جمع، اُدھار ان سب چیزوں کی ضرورت پیش آئی۔ ہندوستان میں تو بینک تھے نہیں، اِس لیے تجارت کے سِلسلے میں انھوں نے خود اپنے ہی کچھ 'کاروبار گھر' (جنھیں انگریزی میں 'مرچنٹ ہاؤس' کہا جاتا تھا) کلکتے میں کھولے تھے۔ ان کا اصلی کام تو ہندوستان میں انگریزی سامان لانا، اس کو بیچنا اور کبھی یہاں سے کچّا مال خرید کر بھیجنا ہی تھا لیکن ضرورت سے مجبور ہوکر یہ 'کاروبار گھر' بینک کا کاروبار بھی کرنے لگے۔ ان 'کاروبار گھروں' میں کمپنی کا روپیہ تو جمع ہوتا ہی تھا، کمپنی کے انگریز افسر اپنا ذاتی روپیہ بھی انہی کے پاس جمع کروانے لگے۔

پھر کمپنی نے آہستہ آہستہ یہاں کے دیسی بینک کاروں یعنی مہاجنوں وغیرہ سے بھی تعلق پیدا کرنا شروع کیا۔ یہ لوگ افسروں کو بھی اُدھار دیتے اور کاروبار میں بھی مدد پہنچاتے تھے۔ لیکن یہاں کے مہاجن اور ساہوکار انگریزی کاروبار اور

اس کے طریقوں کو نہیں جانتے تھے۔ اس لیے یہ زیادہ دن میدان میں نہ ٹھہر سکے اور آہستہ آہستہ 'ایسٹ انڈیا کمپنی' سے ان کا تعلق ٹوٹتا چلا گیا۔

دوسری طرف 'ایسٹ انڈیا کمپنی' کا صرف کاروبار ہی نہیں بڑھا بلکہ ہندوستان کے مختلف علاقوں میں اس کی حکومت قایم ہونی شروع ہو گئی اور آہستہ آہستہ پھیلتی ہی رہی۔ حکومت کو روپے پیسے کی مستقل ضرورت پیش آتی رہتی تھی، جس کے لیے بینکوں کا ہونا ضروری تھا۔ اور بس یہی دو باتیں تھیں جن سے مجبور ہو کر 'ایسٹ انڈیا کمپنی' کو ہندوستان میں نئے بینکوں کا کاروبار بھی شروع کرنا پڑا۔

ایک بات اور بھی تھی۔ ہندوستان کی مختلف ریاستوں میں مختلف سکے چلتے تھے، جن کی دھاتیں بھی مختلف ہوتی تھیں اور قیمتیں بھی مختلف۔ ایسی صورت میں نئے ڈھنگ کے بینک کیسے کام کر سکتے تھے؟ بس 'ایسٹ انڈیا کمپنی' نے اپنے تمام علاقوں میں ایک ہی سکّہ چلا دیا اور وہاں کے سارے دیسی سکے بند کر دیے۔ یہ سکہ کسی ہندوستانی بادشاہ، راجہ یا نواب کا نہیں تھا بلکہ 'ایسٹ انڈیا کمپنی بہادر' کا ہی تھا۔ اب ان علاقوں میں بینک کھولنے میں بھی کوئی دقّت یا مشکل نہیں تھی۔

حکومت کی ضرورت اور 'ایسٹ انڈیا کمپنی کی مالی پریشانیوں میں کچھ آسانی پیدا کرنے کے لیے بینک کھولنے کی کوشش کافی پہلے سے ہو رہی تھی۔

ہمارے ملک میں کھلنے والے نئے ڈھنگ کے بینکوں میں شاید سب سے پہلا بینک مدراس میں 1683 میں قایم ہو گیا تھا۔ پھر اس کے بعد 1742 میں بمبئی میں ایک بینک قائم ہوا جس کا نام گورنمنٹ بینک آف بمبئی تھا۔ اس بینک کو نوٹ جاری کرنے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ اسی طرح یہی ہندوستان کا وہ پہلا بینک تھا جس نے کاغذی سکہ

مُلک کے تھوڑے سے علاقے میں چلانا شروع کیا تھا۔ 1770 میں کلکتے میں 'بینک آف ہندوستان' کے نام سے ایک بینک کھُلا۔

پھر 'ایسٹ انڈیا کمپنی' کے بنگال کے گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز نے 1770 کے بعد ایک بینک کھُلوایا، جس کا نام 'جنرل بینک' تھا۔ یہ حِصّے داری کے اصول پر قایم ہوا تھا، یعنی 'بینک آف انگلینڈ' کی طرح اس کے مالک بھی کچھ حِصّے دار تھے اور اِسی لیے عام طور پر اسے ملک کا باقاعدہ اور نئے اصولوں پر قایم ہونے والا پہلا بینک مانا جاتا ہے۔ یہ بینک کچھ سال کام کرنے کے بعد بند ہو گیا۔ پھر اِسی نام سے ایک اور بینک 1776 میں کھُلا۔ کوئی پندرہ سال کام کرنے کے بعد یہ بھی بند کر دیا گیا۔ پھر اس کے بعد 1806 میں ایک بینک 'بینک آف کلکتہ' کے نام سے کھُلا جو کچھ دن بعد 'بینک آف بنگال' کے نام سے مشہور ہوا۔

کوئی بیس سال تک 'بینک آف بنگال' ہی مُلک بھر میں اکیلا بینک رہا جو 'ایسٹ انڈیا کمپنی' اور اس کی حکومت کے روپیے کے لین دین اور کاروبار میں مدد پہنچاتا تھا۔ لیکن اب اِس چکّر کی شروعات ہو چکی تھی۔

1829 کے بعد سے باقاعدہ بینک کھُلنے شروع ہوئے۔ چنانچہ 1850 میں مُلک میں چودہ بینکوں نے کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ اور 1913 میں مُلک میں کُل چوالیس بینک اور ان کی شاخیں کام کرنے لگی تھیں۔

یہ بینک بھی وہ سارے ہی کام کرتے تھے جو تم اِس سے پہلے یوروپ کے مُلکوں کے بینکوں کے بارے میں سُن چکے ہو۔ صرف انھیں اپنے نوٹ جاری کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ اِس کی اجازت صرف تین بینکوں کو دی گئی تھی۔ ایک 'بینک آف بنگال' تھا جس کا نام تم سُن چکے ہو، دوسرا 'بینک آف بمبئی' تھا جو 1840 میں قائم ہوا تھا اور تیسرا 'بینک آف مدراس' تھا جو

1843 میں کھلا تھا۔ ان بینکوں کے سرمایے میں خود ایسٹ انڈیا کمپنی کے بھی حِصّے تھے اور یہ ایک طرح سے حکومت کے بینک تھے۔ اِسی لیے انھیں کاغذ کے نوٹ جاری کرنے کی بھی اجازت دے دی گئی تھی۔ انھیں 'پریسیڈینسی بینک' کہا جاتا تھا۔

مگر 1861 سے نوٹ جاری کرنے کا کام ان بینکوں سے بھی واپس لے لیا گیا اور اب یہ کام خود حکومت ہی کرنے لگی۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ 1861 سے ہمارے مُلک میں باقاعدہ کاغذی سِکّہ اِس طرح چلنا شروع ہو گیا جیسے دھات کے سِکّے چلتے ہیں۔

اب ذرا سا بینک کی کہانی سے ہٹ کر یہ اور دیکھتے چلیں کہ ہمارے مُلک میں ہماری جیبوں پر دھات کے سِکّوں کی کِتنے دن حکومت رہی۔ ویسے دھات کے سِکّے چلتے تو آج بھی ہیں مگر آج کل زیادہ کام نوٹوں سے ہی لیا جاتا ہے۔ ہاں تو ہمارے مُلک میں لگ بھگ 300 اور 200 قبل مسیح کے درمیان کِسی وقت پہلے بادشاہی، دھات کے سِکّے چلنے شروع ہوئے تھے۔ دھات کے سِکّے چلنے تو اس سے پہلے بھی تھے مگر وہ کِسی بادشاہ کے نہیں ہوتے تھے۔ سُناروں یا تاجروں کے چلائے ہوئے دھات کے ٹُکڑے ہوتے تھے۔ اُس وقت سے اور 1861 تک یعنی لگ بھگ دو ہزار سال سے بھی زیادہ عرصے تک ہماری جیبوں پر دھات کے سِکّوں کی ہی حکومت رہی یا ہماری دولت کو دھات کے سِکّوں میں ناپا جاتا رہا۔ بہرحال یہ ایک الگ اور دلچسپ کہانی ہے جسے میں اپنی ایک اور کتاب 'پیسے کی کہانی' میں سُنا چُکا ہوں۔

اب ایک بار پھر اپنے مُلک میں بینکوں کی ترقّی کو دیکھیں۔

دوسری جنگِ عظیم کے زمانے میں ہندوستان میں بینک کا کاروبار

خاص طور پر پھیلا۔ چونکہ جنگ کے زمانہ میں صنعت اور کاروبار خوب پھیلے اس لیے روپیے کی بہت ضرورت پیش آئی اور اس کا کاروبار اور پھیلاؤ بڑھا۔ ایسی صورت میں بہت سے چھوٹے بڑے، مضبوط اور کمزور بینک ہمارے مُلک میں کھُل گئے۔ اور پھر جس وقت ہمارا مُلک آزاد ہوا ہے تو مُلک میں چھوٹے بڑے سب مِلا کر لگ بھگ ساڑھے سات سو بینک کام کر رہے تھے جس میں پندرہ بینک دوسرے مُلکوں کے تھے اور ہمارے مُلک میں کاروبار کر رہے تھے۔

اب سے سوا سو یا ڈیڑھ سو سال پہلے جو بینک کھُلے وہ لگ بھگ ایسے ہی تھے اور اسی طرح کاروبار کرتے تھے جس طرح آج کے بینک کرتے ہیں۔ جب کسی کو کوئی بینک کھولنا ہوتا تھا تو وہ اسے شروع کرنے کے لیے اس بینک کے حصّے بیچ کر روپیہ حاصل کرتا تھا اور بینک کا کام شروع کر دیتا تھا مطلب یہ ہوا کہ ہر بینک کے مالک حصّے دار ہوتے تھے، جو ظاہر ہے کہ پیسے والے اور بڑے بڑے سرمایہ دار ہی ہو سکتے تھے۔ بینک کا سارا کاروبار ادھار، نقد صرف انہی چند مالکوں کی رائے سے ہوتا تھا۔ یہ صورت اس سارے عرصے میں اسی طرح چلتی رہی۔ ابھی چند سال پہلے اس میں ایک تبدیلی آئی ہے اور اب ان بینکوں کی مالک خود جنتا ہو گئی ہے۔ یہ بہت بڑی تبدیلی ہے ہندوستانی بینکوں کی تاریخ میں۔ اِس لیے ہم اسے تھوڑا سا تفصیل کے ساتھ تمھیں بتلانے کی کوشش کریں گے۔

لیکن اِس سے بھی پہلے اپنے مُلک کے سب سے بڑے بینک، بینکوں کے بینک، یعنی 'ریزرو بینک' کے متعلق تمھیں تھوڑا بہت اور بتلاتے چلیں۔

چوتھا باب

بینکوں کا بینک

رِزرو بینک

دُنیا کے جس مُلک میں بھی بینکوں کا کاروبار شروع ہوا اور پھیلا وہاں جلدی ہی یہ بات بھی سمجھ لی گئی کہ بینکوں کا کاروبار ایک ایسا گھوڑا ہے جس کے مُنہ میں لگام نہیں ہے۔ اگر اس کو ذرا بھی بے قابو چھوڑ دیا گیا تو یہ سارے مُلک کی معاشی زندگی کو ہی پریشان کر سکتا ہے۔ تم دیکھ ہی چکے ہو کہ بینکوں کے ذریعے روپیہ جمع (+) نہیں ہوتا بلکہ ضرب (×) ہوتا ہے۔ یہ بینک اپنی جمع سے کہیں زیادہ رقموں کا اُدھار بھی دے سکتے ہیں اور کاغذی نوٹ بھی چھاپ سکتے ہیں۔ اب فرض کرو کہ ایک وقت ایسا آتا ہے کہ جب مُلک میں روپیے کی بہت زیادہ ضرورت نہیں ہے۔ لیکن بینک کو تو صرف اپنے منافع کا خیال ہوتا ہے۔ اگر وہ پہلے ہی کی طرح اُدھار دیتے رہیں تو مُلک میں روپیہ بڑھتا ہی چلا جائے گا۔ اور یہ ایسا ہی ہوگا جیسے کسی مریض کو کھانا نقصان پہنچاتا ہو، ڈاکٹر نے اس پر کھانے کی پابندی لگا رکھی ہو، مگر گھر کے لوگ اُسے برابر کھانے کو دیے جائیں۔

اِس لیے شروع سے ہی مُلکوں کی حکومتوں نے ایک ایسا بینک ضرور

کھولا جس پر خود حکومت کا قابو ہو اور یہ بینک مُلک کے باقی بینکوں پر کچھ قابو رکھ سکے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہم نے دیکھا تھا کہ ہندوستان میں شروع سے ہی 'پریسیڈینسی بینک' کام کر رہے تھے۔ جنوری 1921 میں ان تینوں 'پریسیڈینسی بینکوں' کو ختم کر دیا گیا یا یوں کہو کہ انھیں ایک دوسرے میں مِلا دیا گیا اور ایک نیا بینک 'امپیریل بینک' یعنی شاہی بینک قایم کیا گیا۔

'امپیریل بینک' ویسے تو دوسرے بینکوں جیسا ہی ایک بینک تھا۔ اِس کے مالک بھی اور بینکوں کی طرح بہت سے حِصّے دار تھے۔ یہ بھی رقمیں جمع کرتا تھا اور اُدھار دیتا تھا، لیکن حکومت کے کچھ کام اس کے سپرد کر دیے گئے تھے ــــ جیسے حکومت کا روپیہ جمع رکھنا۔ حکومت کو جب ضرورت پیش آئے اُدھار دینا، حکومت کی طرف سے ہر قِسم کا لین دین کرنا وغیرہ۔

اب 1935 کے بعد سے ہمارے مُلک کا سب سے بڑا بینک 'رِزرو بینک' ہے، اور یہ تمام کام جو کبھی 'امپیریل بینک' کرتا تھا اب صرف رِزرو بینک کرتا ہے۔ 'امپیریل بینک' کو 'اسٹیٹ بنک' کا نام دے دیا گیا ہے اور اب یہ 'رِزرو بینک' کے ساتھ حکومت کے ایک مددگار بینک کی طرح کام کرتا ہے۔ شروع میں 'رِزرو بینک' کے مالک بھی حِصّے دار تھے لیکن 1949 میں اِسے ہمارے مُلک کی آزاد قوم کی ملکیت میں دے دیا گیا۔

چوکیدار

کِسی بھی مُلک کے 'رِزرو بینک' کو وہاں کی معاشی زندگی کا 'چوکیدار' کہا جاتا ہے۔ تم اب تک بینکوں کے متعلق جِتنا کچھ سمجھ سکے ہو اور آگے جاکر جِتنا سمجھوگے اس سے تمھیں یہ ضرور احساس ہوگا کہ آج کل ہماری معاشیات،

روپیے کا لین دین، کاروبار بلکہ ہماری زندگی کا خاص طور پر وہ حصّہ جس کا تعلق روپیے پیسے سے ہے اب سیدھا سادا نہیں ہے بلکہ یہ بہت گنجلک ہوگیا ہے۔ اب اگر اس پر پُوری طرح قابو نہ رکھا جائے تو مُلک کو بڑی مشکل کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ان مشکلوں کو تم ایک چھوٹی سی مثال سے کچھ آسانی سے سمجھ سکوگے۔

ہمارے مُلک میں شمالی حِصّے میں گیہوں کی فصل مارچ، اپریل میں کٹتی ہے، اور کسان اپنا غلّہ بازاروں میں لاتے ہیں۔ تھوڑا بہت غلّہ تو عام آدمی اپنی وقتی ضرورت کو پُورا کرنے کے لیے خرید لیتے ہیں۔ اور پچھلے کچھ سالوں سے فصل کا کچھ حِصّہ حکومت بھی خرید کر اپنے گوداموں میں جمع کر لیتی ہے تاکہ پُورے سال جہاں جہاں ضرورت ہو وہاں پہنچایا جاسکے۔ لیکن ابھی چند سال پہلے تک یہ غلّہ زیادہ تر بڑے بڑے بیوپاری آڑھتی وغیرہ ہی خریدتے تھے اور اب بھی حکومت کے خریدنے کے باوجود یہ لوگ اس کا کافی بڑا حِصّہ اپنے گوداموں میں رکھتے ہیں۔ کسانوں کو روپیے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اُن کے پاس اناج رکھنے کے لیے جگہ بھی نہیں ہوتی، اِس لیے وہ اسے بیچنے کے لیے مجبور ہوتے ہیں، اور چونکہ منڈیوں میں ہر طرف سے مال آرہا ہوتا ہے اِس لیے اس وقت اس کی قیمت بھی کم لگتی ہے۔

اچھا ان بڑے بڑے بیوپاریوں کے پاس روپیہ کہاں سے آتا ہے؟ تم جانتے ہو کہ اس کا زیادہ بڑا حِصّہ بیوپاری اور آڑھتی بینکوں سے ہی اُدھار لیتے ہیں۔ اب دیکھو اگر ان بیوپاریوں کو بالکل آزاد چھوڑ دیا جائے کہ وہ جِتنا روپیہ چاہیں اُدھار لیں اور اپنے گودام بھرلیں تو یہ نئی فصل کا سارا کا سارا اناج اپنے قبضے میں کرلیں گے اور پھر جب بازاروں میں اناج آنا بند ہو جائے گا

تو اسے خوب اونچی اونچی قیمتوں پر بیچیں گے اور مُلک کے لوگوں کے لیے پریشانیاں پیدا ہوں گی۔

لیکن اگر ان کے اُدھار لینے پر ہی پابندی لگا دی جائے یا اُدھار دیے جانے والے روپیے پر سُود کی شرح بڑھا دی جائے تو بیوپاریوں کو اُدھار لینا مہنگا پڑے گا اور وہ کچھ کم روپیہ اُدھار لیں گے۔

تو جیسا میں نے ابھی کہا تھا آج کل معاشی نظام سیدھا سادا نہیں ہے، اِس لیے حکومت کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ اس پر قابو رکھے، اور اِسی لیے حکومت نے ایک سب سے بڑا بینک 'رزرو بینک' کھولا ہے جو اِن بینکوں کے کاروبار پر کئی طریقوں سے قابو رکھتا ہے، اور اِسی لیے اِسے بینکوں کا چوکیدار کہا جاتا ہے۔ اچھّا اب آؤ ذرا دیکھیں کہ اس بینک یعنی 'رزرو بینک' کے سپرد کیا کیا کام ہیں۔

کرنسی

'کرنسی' انگریزی کا لفظ 'Currency' ہے جس کے معنی ہیں 'جو چیز چل رہی ہو یا مُستقل گھوم رہی ہو'۔ ہمارے مُلک کے دھات کے سِکّے، ایک روپیہ، دس روپیے کے نوٹ یہ سب چیزیں 'کرنسی' ہیں۔

ہمارے مُلک کی 'کرنسی' میں ایک چھوٹا سا فرق ضرور سمجھ لو۔ تم دیکھو گے کہ ہمارے دو روپیے اور اِس سے اُوپر کے جتنے نوٹ بھی ہیں ان پر لِکھا ہوا ہے:

"میں یہ نوٹ رکھنے والے کو دو روپیے ادا کرنے کا وعدہ کرتا ہوں"۔
دستخط (گورنر) رزرو بینک

لیکن یہ وعدہ تمھیں ایک روپیے کے نوٹ پر تو لکھا ہوا نظر نہیں آتا۔ جانتے ہو ایسا کیوں ہے؟

اصل میں بات یہ ہے کہ ہمارا روپیہ پیسہ یا دولت حکومت جاری کرتی ہے۔ اور چاہے یہ ایک روپیے کے نوٹ یا سِکّے کی شکل میں ہو یا چھوٹے سِکّوں کی شکل میں ہو یہ ہمارا ویسا ہی اصلی روپیہ یا پیسہ ہے، جیسا پہلے سونے چاندی کا سِکّہ ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ دو روپیے، پانچ روپیے وغیرہ کے نوٹ صرف اس روپیے پیسے کی کچھ شکلیں ہیں اور انھیں جاری کرنے کی اجازت حکومت نے 'رزرو بینک' کو دے دی ہے۔ اگر تم 'رزرو بینک' جاؤ اور اپنا سَو روپیے کا نوٹ دو اور اس کے بدلے میں تم اپنی حکومت کا جاری کیا ہوا اصلی روپیہ مانگو تو وہاں سے تمھیں ایک ایک روپیے کے سِکّے یا نوٹ مِل سکتے ہیں۔ اور یہی وعدہ 'رزرو بینک' کے گورنر صاحب ہر نوٹ پر لکھ دیتے ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ ایک روپیے کا نوٹ اور سِکّہ تو ہماری حکومت کی وزارتِ مالیات کا جاری کیا ہوا ہوتا ہے اور ہماری اصلی دولت یا سِکّہ ہوتا ہے اور بڑے نوٹ اس کی ایسی کچھ شکلیں ہیں جو لین دین کی آسانی کے لیے حکومت کا ایجنٹ یعنی 'رزرو بینک' اپنی طرف سے چلاتا ہے۔ دو لفظوں میں اسے یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ ایک روپیے کا نوٹ تو 'کاغذی سِکّہ' ہے اور دوسرے بڑے نوٹ 'بینک نوٹ' ہیں۔

تو اب حکومت نے مُلک میں چلنے والی کرنسی کے سارے کام 'رزرو بینک' کو سونپ دیے ہیں۔ 'رزرو بینک' ہی حکومت کو بتلاتا ہے کہ مُلک میں اِس وقت کتنے روپیے پیسے لوگوں کے ہاتھوں میں ہونے چاہئیں، تاکہ لوگوں کو خرید و فروخت میں چھوٹے بڑے سِکّوں کے لین دین اور بدلنے میں پریشانی

نہ ہو۔ یہ تو تم خود ہی سمجھ سکتے ہو کہ بہت زیادہ پیسے والے لوگوں کو تو بڑے یعنی سو روپیے، ہزار روپیے وغیرہ کے نوٹوں کی ضرورت پیش آسکتی ہے لیکن ہمارے مُلک کے عام آدمیوں کو تو چھوٹے نوٹوں یعنی دو روپیے، پانچ روپیے اور دس روپیے وغیرہ کے نوٹوں کی ضرورت زیادہ پڑتی ہوگی۔ رِزرو بینک، مُلک کی مالی حالت دیکھتے ہوئے ان نوٹوں کو چھپواتا اور چلاتا ہے۔

حکومت نے 'رِزرو بینک' کو -/2 روپیے، -/5 روپیے، -/10 روپیے، -/20 روپیے، -/50 روپیے، -/100 روپیے، 1000 روپیے، -/5000 روپیے اور 10,000 روپیے کے نوٹ چلانے کی اجازت دے رکھی ہے۔ اب ذرا یہ دیکھو کہ مارچ 1976 میں ہمارے مُلک میں کتنے اور کِس قیمت کے نوٹ چل رہے تھے:

ایک نوٹ کی قیمت	نوٹوں کی تعداد	تمام نوٹوں کی کُل قیمت
10,000 روپیے	1,260	1,26,00,000
5.000 〃	45,8000	22,90,00,000
1,000 〃	8,79,100	87,91,00,000
100 〃	34,21,67,00,000	34,21,67,000
50 〃	1,72,72,000	86,36,00,000
20 〃	21,23,85,000	4,24,77,00,000
10 〃	1,88,00,00,000	18,80,00,00,000
5 〃	1,06,42,40,000	5,32,12.00,000
2 〃	57,90,00,000	1,15,80,00,000
1 〃	2,92,77,00,000	2,92,77,00,000

ایک روپیے کے سِکّے	———	53,04,00,000
چھوٹے سِکّے	———	2,24,96,00,000

مُلک میں موجود کُل کرنسی	71,43,56,00,000

اِن رقموں سے تمھیں تھوڑا سا یہ اندازہ تو ضرور ہی ہو جائے گا کہ آج سے لگ بھگ سال بھر پہلے ہمارے مُلک میں کِتنے نوٹ اور کِتنے روپیے کے سِکّے لوگوں کے ہاتھوں میں گھُوم رہے تھے۔

تو بھائی یہ تھا 'رِزرو بینک' کا ایک کام، یعنی مُلک کی کرنسی چلانا، اس کا نظام صحیح رکھنا اور اس کو بدلتے رہنا۔

حکومت کا بینک

بینک کے لین دین میں سب سے بڑے گاہک ہماری مرکزی حکومت اور ہمارے مُلک کی ریاستی حکومتیں ہیں۔ یہ حکومتیں کارخانوں، بیوپاریوں اور عام لوگوں کی طرح روپیہ بینک میں جمع کراتی ہیں، اپنا روپیہ نِکلواتی ہیں، بینک سے اُدھار لیتی ہیں، ضمانتیں رکھتی ہیں، بینک کے ذریعے سے مُلک کی جنتا سے اُدھار لیتی ہیں اور اِن سے مُلک کی ترقی کے لیے منصوبے چلاتی ہیں۔ یہ سارا کام ہمارا 'رِزرو بینک' ہی کرتا ہے۔ اِس لیے مرکزی حکومت اور ہر صوبائی حکومت کا ایک کھاتہ 'رِزرو بینک' میں بھی ہوتا ہے۔

روپیے پیسے کے سارے معاملوں میں 'رِزرو بینک' ہی حکومتوں کو مشورہ بھی دیتا ہے۔ ان کے لیے جنتا سے اُدھار جمع کرتا ہے۔ اُدھار اور اس کے سُود کی واپسی بھی اسی کے ذریعے ہوتی ہے۔ غرض مُلک کے

مالی معاملات میں 'رِزرو بینک' کی حیثیت کچھ ایسی ہوتی ہے جیسے ہمارے تمھارے جسم میں ریڑھ کی ہڈی ہوتی ہے۔

کسی بھی مُلک کے سامنے ایک سب سے بڑا مسئلہ دوسرے مُلکوں سے روپیے پیسے کے لین دین اور تجارت کا ہوتا ہے۔ کسی دوسرے مُلک کے سِکّے کے بدلے میں اپنے مُلک کا کتنا روپیہ لیا دیا جائے — جیسے ایک امریکی 'ڈالر' کے بدلے میں، یا روسی 'روبل' کے بدلے میں، یا ایک برطانوی پونڈ اسٹرلنگ کے بدلے میں، یا ایک جاپانی 'ین' کے بدلے میں ہم کتنے روپیے انھیں دیں یا ان سے لیں؟ اسے 'زرِ مبادلہ' یا 'Foreign Exchange' کہتے ہیں۔ یہ بڑا مشکل اور اُلجھا ہوا سا مسئلہ ہوتا ہے۔ ہمارے مُلک کے 'رِزرو بینک' کے ہی سپرد یہ معاملات طے کرنا بھی ہے۔ اِسی لیے آپ جب کسی دوسرے مُلک جاتے ہیں تو 'رِزرو بینک' ہی آپ کو اُس مُلک کا روپیہ دیتا ہے۔ اور اِس کا مطلب یہ بھی ہوا کہ کسی دوسرے مُلک سے تجارت بھی صرف 'رِزرو بینک' کے ذریعے ہی ہو سکتی ہے۔

مُلک میں روپیے پیسے کا 'پھیلاؤ'

چونکہ 'رِزرو بینک' تھوڑے تھوڑے دن بعد مُلک کی مالی حالت، مُلک میں روپیے پیسے کے 'پھیلاؤ' کی ضرورت اور اس کی موجودگی وغیرہ کی جانچ پڑتال کرتا رہتا ہے اِس لیے اسے معلوم ہوتا ہے کہ کس وقت مُلک میں روپیے کی مقدار یا اِس کا 'چکّر' اور 'پھیلاؤ' بڑھانا چاہیے اور کس وقت کم کرنا چاہیے۔

اب جیسے ہندوستان میں معاشیات کے بڑے بڑے ماہروں نے یہ

اندازہ لگایا ہے کہ مُلک میں روپیے پیسے کا سب سے زیادہ لین دین مارچ اپریل کے مہینے میں ہوتا ہے۔ اسی زمانے میں شمالی ہندوستان میں ربیع کی فصل کٹتی ہے، بازاروں میں خوب اناج آتا ہے، خریدا اور بیچا جاتا ہے اور حد تو یہ ہے کہ شمالی ہندوستان کے گاؤں میں تو شادی بیاہ اور خوشیاں، تقریبیں تک عام طور پر لوگ اسی زمانے میں کرتے ہیں۔ اِسی لیے اس زمانے میں روپیے پیسے کا چکّر بہت بڑھ جاتا ہے۔

اب اس وقت اگر اس چکّر کو قابو میں نہ رکھا جائے تو مُلک میں مالی پریشانیاں پیدا ہونے لگتی ہیں۔ اس کی ایک چھوٹی سی مثال تو تم ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی سُن چکے ہو۔

اِس پر تھوڑا بہت قابو تو اِسی طرح رکھا جا سکتا ہے کہ 'رِزرو بینک' اپنی طرف سے جاری کیے جانے والے نوٹوں پر ہی قابو رکھے۔ جب ضرورت ہو نوٹ بڑھا دے، جب ضرورت نہ ہو تو انھیں اپنے پاس روک لے۔ مگر ساتھ ہی ساتھ تم یہ بھی جانتے ہو کہ یہ تو روپیے کی وہ تعداد ہے جو بالکل نقد روپیوں کی صورت میں لوگوں کے ہاتھوں میں جاتی ہے۔ اصل چیز تو اس کا 'چکّر' یا 'پھیلاؤ' ہے جسے بینکوں کی طرف سے دیا جانے والا اُدھار پیدا کرتا ہے۔ اِس لیے اگر اِس 'چکّر' یا 'پھیلاؤ' پر ہی روک نہ لگائی جائے تو روپے کو کم یا زیادہ کرنے سے بہت معمولی سا ہی اثر پڑے گا۔

رِزرو بینک کے پاس کچھ ایسے طریقے بھی ہیں جن سے یہ اس 'پھیلاؤ' کو بھی گھٹا بڑھا سکتا ہے۔ اِسی لیے کچھ لوگ 'رِزرو بینک' کو کسی مُلک کی موٹر گاڑی کا 'اسٹیئرنگ' یا 'ایکسلریٹر' بھی کہتے ہیں۔ اب اس کام کو دیکھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم یہ دیکھیں کہ 'رِزرو بینک' اور مُلک کے دوسرے

بینکوں میں کیا رِشتہ ہوتا ہے۔

بینکوں کا بینک

تم نے دیکھا کہ بینک کا کام کچھ گنجلک سا ہوتا ہے۔ یہ اُدھار دیتے ہیں اور ضمانتیں رکھتے ہیں۔ یہ اُدھار دیا جانے والا روپیہ بھی بینکوں کا اپنا نہیں ہوتا۔ ہمارا، تمھارا، یا ان لوگوں کا ہوتا ہے جو بینکوں میں جمع کرتے ہیں۔ اس جمع میں سے یہ تھوڑا بہت اپنے پاس محفوظ رکھ کر باقی کو کاروبار اور اُدھار میں لگا دیتے ہیں۔ اب کبھی کبھی کسی بینک کو ایک دم کچھ زیادہ روپیے کی ضرورت بھی پڑ سکتی ہے، یا اس کے پاس ضرورت سے زیادہ روپیہ جمع بھی ہو سکتا ہے۔ خیر زیادہ جمع ہونے میں تو کوئی خاص پریشانی نہیں ہوتی۔ مگر جب ایک دم روپیے کی ضرورت پڑ جائے تو بینک کس کے سامنے ہاتھ پھیلائے؟ یہ صحیح ہے کہ بینک کے پاس لوگوں کی ضمانتیں بھی ہوتی ہیں، 'بل آف ایکسچینج' اور ایسی قیمتی چیزیں ہوتی ہیں، جنھیں وہ بیچ کر یا گروی رکھ کر روپیہ حاصل کر سکتا ہے۔ مگر انھیں کھلے بازار میں بیچ کر یا گروی رکھ کر پیسے حاصل کرنے میں کافی وقت لگ جاتا ہے، اور بینک کو تو فوراً ہی روپیے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب کون ہے جو بینک کو لاکھوں بلکہ کروڑوں روپیے کا اُدھار دے گا ــــــ؟ بس ایسے آڑے وقتوں میں یہ بینکوں کا بینک یعنی 'رزرو بینک' ہی ان کے کام آتا ہے۔

ہاں تو بات ہو رہی تھی کہ رِزرو بینک کے پاس کچھ ایسے طریقے ہوتے ہیں جن سے یہ تجارتی بینکوں کے پیدا کیے ہوئے روپیے کے 'پھیلاؤ' یا 'چکر' پر بہت حد تک قابو رکھ سکتا ہے۔

اِس میں سب سے پہلی چیز تو یہ ہے کہ ہر بینک اپنا کچھ روپیہ رِزرو بینک میں جمع رکھوانے کے لیے قانونی طور پر مجبور ہے۔ اب جیسے آج کل ہر بینک اپنی کُل جمع کا 6 فیصدی رِزرو بینک کے پاس ضرور جمع رکھتا ہے۔ رِزرو بینک اس مقررہ شرح کو گھٹا بڑھا بھی سکتا ہے۔ اس 6 فیصدی پر تو کوئی سُود نہیں مِلتا لیکن اگر رِزرو بینک چاہے تو بینکوں سے کچھ اور روپیہ جمع کرنے کے لیے بھی کہہ سکتا ہے۔ اس پر وہ سُود بھی دیتا ہے۔ اب اگر رِزرو بینک سُود زیادہ دیتا ہے تو ظاہر ہے مُلک کے تجارتی بینک اس کے پاس زیادہ روپیہ جمع کروائیں گے اور اگر رِزرو بینک سُود کی شرح کم کر دے تو بینک اس کے پاس کم روپیہ جمع کرواتے ہیں، اور اس روپیے کو لوگوں کو زیادہ سُود پر اُدھار دے دیتے ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ اگر کسی وقت رِزرو بینک یہ چاہے کہ مُلک کے بینک مُلک میں روپیے کا پھیلاؤ کچھ گھٹا دیں اور روپیہ لوگوں کو اُدھار دینے کی بجائے رِزرو بینک میں جمع کروائیں تو وہ سُود کی شرح کو تھوڑا سا اُونچا کر دے گا۔ اور چونکہ اب بینکوں کو رِزرو بینک میں روپیہ جمع کرنے سے زیادہ فائدہ مِلے گا اس لیے یہ اپنا روپیہ لوگوں کو اُدھار نہیں دیں گے بلکہ اسے رِزرو بینک میں ہی جمع کروائیں گے۔ اس کے برخلاف اگر رِزرو بینک سُود کی شرح گھٹا دے تو بینک زیادہ روپیہ رِزرو بینک کے پاس جمع نہیں کروائیں گے، اسے لوگوں کو اُدھار زیادہ دیں گے۔

اور پھر ایک اور چیز بھی ہے رِزرو بینک کے پاس، جس کے ذریعے یہ بینکوں کی طرف سے اُدھار دیے جانے والے روپیے پر اپنا قابو رکھ سکتا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہم پڑھ رہے تھے کہ ہر تجارتی بینک کے پاس کچھ ایسی ضمانتیں، بِل آف ایکسچینج، ہُنڈیاں اور دوسرے کاروباری کاغذ ہوتے ہیں

جنھیں بیچ کر یا گروی رکھ کر یہ ضرورت پڑنے پر روپیہ حاصل کر سکتا ہے۔ اِس سِلسلے میں بھی رِزرو بینک ہی ان کی مدد کرتا ہے۔ وہ کچھ کٹوتی کاٹ کر ان ضمانتوں اور بیوپاری کاغذوں کے بدلے میں روپیہ دے دیتا ہے۔ اِس کٹوتی کو انگریزی میں 'بینک ریٹ' کہتے ہیں۔ یہ 'کٹوتی' یا 'بینک ریٹ' رِزرو بینک کے پاس ایک بڑا کارآمد ہتھیار ہوتی ہے۔

فرض کرو کہ رِزرو بینک کسی زمانے میں سَو روپیے کی ضمانت کا کاغذ لے کر پچانوے روپیے فوراً دے رہا ہے۔ اگر بینک یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس شرح پر روپیہ لے کر لوگوں کو اُدھار دینے میں فائدہ ہے تو وہ اپنے یہ کاغذ 95 روپیے میں رِزرو بینک کے پاس رکھ دیں گے اور لوگوں کو زیادہ اُدھار دیں گے۔ اب فرض کرو کہ کچھ دن بعد رِزرو بینک کو احساس ہوتا ہے کہ مُلک کے بینکوں کے ذریعے اُدھار کا پھیلاؤ تیزی سے بڑھ رہا ہے اور اسے کم کرنا ضروری ہے۔ بس اب وہ اپنی کٹوتی کی شرح کو بڑھا دے گا۔ یعنی سَو روپیے کے کاغذ پر 95 کی بجائے صرف 94 روپیے دے گا۔ ظاہر ہے کہ اب بینکوں کو ہر سَو روپیے پر پانچ کی بجائے چھ روپیے چھوڑنے ہوں گے۔ اب وہ اپنی ضمانتیں پہلے سے کم تعداد میں رِزرو بینک کے پاس لائیں گے، کم روپیہ لیں گے اور نتیجے میں کم روپیہ لوگوں کو اُدھار دیں گے، اور اِس طرح مُلک میں اُدھار کا 'پھیلاؤ' یا 'چکر' کم ہونے لگے گا۔

اِن دو طریقوں کے علاوہ ایک تیسرا طریقہ یہ ہے کہ حکومت خود لوگوں سے اُدھار لے یا اپنی 'ضمانتیں' بازار میں بیچے۔ یہ کام بھی رِزرو بینک کے ذریعے ہی ہوتا ہے۔ اس پر حکومت سُود دیتی ہے۔

عام طور پر اگر ان تین طریقوں پر صحیح صحیح عمل کیا جائے تو رِزرو بینک

ملک کے تجارتی بینکوں کے ذریعے مُلک میں اُدھار کے پھیلاؤ پر کافی حد تک
قابو رکھ سکتا ہے۔

اور پھر چونکہ 'رِزرو بینک' کو بینکوں کا بینک کہا جاتا ہے اِس لیے وہ
ایک اور کام بھی کرتا ہے۔

بینکوں کے حساب کتاب کی بیباقی

ابھی تم پڑھ رہے تھے کہ جس طرح ہم اور تم اپنا حساب کسی بینک میں
رکھتے ہیں، مُلک کے سارے بینک اپنا ایک کھاتہ 'رِزرو بینک' میں رکھتے ہیں۔
اِسی کھاتے کے ذریعے بہت سے بینکوں میں آپسی لین دین بھی ہوتا ہے۔ اب
ذرا سا یہاں ٹھہر کر پہلے یہ دیکھیں کہ بینکوں کو آپس میں لین دین کی ضرورت
کیوں پیش آتی ہے، پھر اس کے بعد یہ دیکھیں گے کہ یہ مسئلہ کیسے حل ہوتا ہے:

تم نے کچھ دیر پہلے دیکھا تھا کہ روشن صاحب نے 500 روپیے راجندر
صاحب کو ادا کیے تھے۔ فرض کرو کہ روشن صاحب کے بینک کا نام (الف)
ہے اور راجندر صاحب کے بینک کا نام (ب) ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہوا کہ
بینک (ب) میں 500 روپیے ایسے جمع ہوئے جو بینک (الف) سے لیے
جانے ہیں۔

اِسی طرح بینک (الف) میں بھی 500 روپیے ایسے جمع ہوئے تھے جو
بینک (ب) کو ادا کرنے تھے۔ اب شہر میں دسیوں بینک ہیں۔ ہر بینک کو
دوسرے بینک سے کچھ روپیہ لینا اور کچھ روپیہ ادا کرنا ہوتا ہے۔ یہ آپسی
حساب بہت مشکل تو نہیں کہا جا سکتا لیکن اِس لیے تھوڑا سا گُنجلک کہا جاتا
ہے کہ بہت سے بینک ہوتے ہیں، سب کو ایک دوسرے سے روپیہ لینا

ہوتا ہے اور ادا کرنا ہوتا ہے اور پھر مشکل سے ہی کبھی ایسی نوبت آتی ہے کہ کوئی بینک کسی بینک کو گن کر نقد روپیہ ادا کرے یا اس سے لے۔ جمع اور گھٹاؤ کی رقمیں آپس میں برابر ہوتی رہتی ہیں۔

یہ 'صفائی' یا 'بیباقی' کا کام جسے انگریزی میں 'Clearing' کہتے ہیں 'رزرو بینک' کے ذریعے ہی ہوتا ہے اور 'رزرو بینک' میں اس کا ایک الگ شعبہ ہوتا ہے جسے 'Clearing Department' کہتے ہیں۔

ایک اور چھوٹا سا کام

ایک اور چھوٹا سا کام بھی رزرو بینک کے ہی ذمّے کیا گیا ہے۔ یہ وہی کام ہے جسے سُن کر تمھیں ممکن ہے وہ کام یاد آجائے جسے آج سے کوئی سات آٹھ سو سال پہلے یوروپ کے وہ صرّاف کیا کرتے تھے جنھیں تم نے دُنیا کا سب سے پہلا بینک کار مانا تھا۔

ہمارے نوٹ روزانہ کتنے ہی ہاتھوں میں آتے ہیں اس لیے یہ جلدی ہی خراب بھی ہو جاتے ہیں۔ کافی کھوج اور تحقیق کے بعد یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ہمارے کاغذی نوٹ کی عُمر ہمارے مُلک میں کم سے کم چار مہینے اور زیادہ سے زیادہ ایک سال ہوتی ہے۔ اس کے بعد یہ اتنا خراب ہو جاتا ہے کہ نیا نوٹ چھاپنا پڑتا ہے۔

تم ذرا کسی نوٹ کو غور سے دیکھو، اس کی چھپائی خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ بہت مشکل بھی ہوتی ہے۔ اس کی چھپائی میں بہت سی ایسی باتیں رکھی جاتی ہیں کہ اس کی نقل آسانی سے نہیں چھاپی جاسکتی۔ اب 1976 میں مارچ کے مہینے میں ہمارے مُلک میں رزرو بینک کے چھپوائے ہوئے نوٹوں

ا کُل تعداد ـــــ جن میں دو روپیے ، پانچ روپیے ، اور اُوپر دس ہزار روپیے
ے کے سارے نوٹ شامل تھے، 4,09,59,90,160 تھی۔ ان کے علاوہ 2,9277,00,000
ٹ ایک روپیے کے تھے جو حکومت کی وزارتِ مالیات کی طرف سے چلائے
گئے تھے۔ اب یہ کُل مِلاکر 7,02,36,90,160 نوٹوں کو مُستقل چھاپتے رہنے میں
و بہت خرچ آتا ہوگا۔ پھر ان کا کاغذ بھی خاص قِسم کا اور کافی قیمتی ہوتا ہے۔
دوسری طرف دھات کے سِکّے کی عُمر کے متعلق یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ یہ لگ بھگ
چالیس سال تک لوگوں کے ہاتھوں میں گھُومنے کے بعد ایسا ہو جاتا ہے یا
تنا گھِس جاتا ہے کہ اِس کا بدل دینا ضروری ہوتا ہے۔ اِسی لیے اب یہ طے
یا گیا ہے کہ چھوٹے نوٹوں کے بدلے دھات کے سِکّے کو زیادہ چلایا جائے۔
بس بھائی اب یہ بات تو ضرور تمھاری سمجھ میں آگئی ہوگی کہ کِسی مُلک کی
معاشیات یا ان معاملوں میں جِن میں روپیے پیسوں یا لین دین کا دخل
ہوتا ہے، رِزرو بینک کِتنی اہم اور ضروری جگہ رکھتا ہے۔ سچّی بات یہ ہے
۔ اگر رِزرو بینک نہ ہو تو اب عام کاروباری بینکوں کا کام اِتنا گنجلک اور
لجھا ہوا سا ہوگیا ہے کہ شاید کام ہی نہ چل سکے۔ اور ہماری حکومت کے
لیے تو رِزرو بینک آنکھ، کان بلکہ دماغ کا کام دیتا ہے۔

پانچواں باب

مالِک کون؟

آج سے کوئی دو ہزار سال پہلے یونان کے فلسفی ارسطو نے ایک بڑے کام کی بات کہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ "یہ بات اتنی اہم اور خاص نہیں ہے کہ کسی چیز کا مالک کون ہے، اصلی بات یہ ہے کہ اس چیز کو استعمال کس طرح کیا جاتا ہے؟"

ذرا سوچو ــــــ ایک بندوق ہے، اگر اس کا مالک کوئی ڈاکو یا لٹیرا ہے تو اس سے شہریوں کو پریشانی اور تکلیف ہوگی اور اگر وہی بندوق پولس یا فوج کے سپاہی کے ہاتھ میں ہوگی تو اس سے شہریوں کے جان و مال کی حفاظت ہوگی اور شہر میں امن و امان قایم ہوگا۔

بھائی بات تو بہت سچّی اور اچھّی کہی تھی اس فلسفی نے ــــــ!

تم نے دیکھا کہ مُلک اور مُلک کے رہنے والوں کی معاشی یا مالی زندگی میں ہمارے بینک کتنا بڑا اور اہم حصّہ لیتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ ان کے مالک کون ہوں ــــــ؟ اس سوال پر بہت سے مُلکوں میں بحث مباحثے ہوتے رہے ہیں اور ہمارے یہاں بھی بڑے بڑے عالم اس پر سوچتے رہے ہیں۔

تم یہ بھی جانتے ہو کہ بینک شروع کرنے والے تو تھوڑے سے ہی لوگ

ہوتے تھے۔ کچھ پیسے والے لوگ مل کر دس بیس لاکھ روپے جمع کر لیتے تھے اور بینک اپنا کاروبار شروع کر دیتے تھے۔ اب اس بینک میں امیر، غریب، چھوٹا، بڑا ہر شخص اپنا روپیہ جمع کرا سکتا ہے اور تمھیں یہ جان کر حیرت ہو گی کہ لوگ اپنا جو روپیہ بینک میں جمع کراتے ہیں وہ کُل ملا کر اس سرمایے سے کہیں زیادہ ہوتا ہے جو شروع میں حصّے دار لوگ جمع کر کے بینک کا کاروبار شروع کرتے ہیں۔ ذرا ہمارے مُلک کے ایک بینک کی رقمیں دیکھو تو تمھیں اندازہ ہو جائے گا۔ اس بینک میں 1973 میں جو سرمایہ لگا ہوا تھا وہ تو صرف 1,41,97,104 روپیے تھا اور جو رقمیں جمع کرانے والوں نے اس کے پاس جمع کی ہوئی تھیں وہ 3,43,77,99,232 روپیے تھیں۔ اس بینک میں جتنے جمع کے کھاتے کھُلے ہوئے تھے — یعنی جتنے لوگوں، کمپنیوں، کارخانوں وغیرہ نے اس میں اپنا روپیہ جمع کروایا تھا — ان کی تعداد 33,71,800 تھی۔ اب دیکھو کہ لوگوں کی جمع کی ہوئی رقم بالکل شروع میں لگائے ہوئے سرمایے سے لگ بھگ ڈھائی سَو گُنا زیادہ تھی۔

ان اوپر کی رقموں کو دیکھ کر ذرا تم سچ سچ کہنا کہ اس بینک کے کاروبار کے مالک وہ لوگ ہونے چاہئیں، یا اس کے کاروبار پر صرف ان لوگوں کا قابو ہونا چاہیے، اور انھیں ہی اس کا منافع ملنا چاہیے جنھوں نے اب سے پچاس ساٹھ سال پہلے لگ بھگ صرف ڈیڑھ کروڑ روپیہ اس بینک کو شروع کرنے میں لگایا تھا یا اس کا منافع ان لوگوں میں بانٹا جانا چاہیے جنھوں نے آج اس بینک میں لگ بھگ تین ارب تینتالیس کروڑ روپیے سے زیادہ کی رقمیں جمع کرا رکھی تھیں۔

سچّی بات تو یہ ہے کہ انھی کی جمع کی بُنیاد پر بینک اِس قابل ہے کہ

اُس نے دو ارب تیس کروڑ اکتالیس لاکھ روپیے Rs 2.30.41,00.000 سے زیادہ کا اُدھار لوگوں میں بانٹ رکھا ہے۔ میری سمجھ میں تو یہی آتا ہے کہ اِس کا منافع تو جمع کرانے والوں کو ہی جانا چاہیے۔

اور پھر اِسی بینک کے کھاتوں کو دیکھ کر پتہ چلتا ہے کہ اس میں بھی بہت بڑی بڑی رقمیں جمع کرنے والوں کی تعداد کم تھی اور چھوٹی چھوٹی رقمیں جمع کرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ جِن لوگوں نے صرف ڈیڑھ ہزار (1500) روپیے سے کم رقم اس سال جمع کرائی تھی وہ تو سَو میں سے نوّے آدمی تھے اور جنھوں نے پانچ ہزار روپیے سے زیادہ رقمیں جمع کرائی تھیں وہ سَو میں سے صرف دو آدمی تھے۔ اس کا مطلب کیا ہوا؟ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر اس کا فائدہ روپیہ جمع کرانے والوں میں بانٹا جائے تو وہ بہت پیسے والوں کو یا ایسے لوگوں کو زیادہ نہیں پہنچے گا جنھوں نے پانچ ہزار روپیے سے زیادہ کی رقمیں بینک کے پاس جمع کرائی تھیں، بلکہ تھوڑی آمدنی والوں کو پہنچے گا، جنھوں نے پانچ روپیے سے لے کر زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ ہزار روپیے بینک میں جمع کرائے تھے۔

اِسی اصول کو تم ملک کے سارے بینکوں کی جمع پر بھی پھیلا سکتے ہو۔ اچھا اب ذرا یہ دیکھیں کہ جب تک فائدہ اُن لوگوں کو پہنچتا تھا جنھوں نے شروع میں سرمایہ لگایا تھا اس کا کیا اثر ہوتا تھا۔

اس میں سب سے پہلی بات تو بالکل سیدھی سادی ہی تھی۔ یہ منافع بینک کے شروع کرنے والوں یا ان کی اولادوں یعنی سیٹھوں، سرمایہ داروں اور پیسے والوں کی جیب میں جاتا تھا۔ روپیہ جمع کرانے والوں کو جن میں مزدور، کسان، کارخانے میں کام کرنے والے لوگ اور تھوڑی آمدنی والے

عام لوگ شامل تھے، نہیں پہنچتا تھا۔

تم اس کا اندازہ پورے مُلک کی ان رقموں سے لگا سکتے ہو جو ہم تمھیں ابھی بتلاتے ہیں۔ 1968 کے دسمبر مہینے میں ان سیٹھ ساہوکاروں کا جتنا روپیہ بھی مُلک کے بڑے بڑے بینکوں کے حصّوں میں لگا ہوا تھا، یعنی وہ روپیہ جس سے بینک شروع کیے گئے تھے، صرف 28,50,00,000 روپیے کے قریب تھا۔ اس کے مقابلے میں پورے مُلک کے بینکوں میں جمع کی ہوئی کُل رقمیں، جن میں چھوٹے بڑے ہر قسم کے جمع کرنے والوں کے پیسے شامل تھے 27,50,00,00,000 روپیے کے قریب تھیں۔ اب بتاؤ مُلک کے اتنے بہت سے روپیوں سے جو منافع ہو اس پر کس کا زیادہ حق ہوگا؟

اور دوسری بات جو ہمارے غریب مُلک کے لیے اس سے بھی بڑی تھی اور ساتھ ہی اتنی ہی بُری بھی تھی، وہ یہ تھی کہ مُلک کے اتنے بڑے سرمایے پر اور اس کے اس پھیلاؤ پر صرف تھوڑے سے پیسے والے لوگوں یا سرمایہ داروں کا پورا پورا قابو تھا۔

تم یہ دیکھ ہی چُکے ہو کہ مُلک کی مالی زندگی میں بینکوں کا اور ان کے اُدھار کے پھیلاؤ کا کتنا بڑا حصّہ ہے۔ یہ بات بھی کہنی غلط نہیں ہوگی کہ اگر بینک چاہیں تو مُلک کے کسی بھی کاروبار کے لیے تو اُدھار سرمایے کی ریل پیل کر دیں اور جس کو چاہیں بھوکا مار دیں۔ اگر تم ذرا غور کرو تو تم دیکھو گے کہ جب تک بینکوں پر ان تھوڑے سے سرمایہ داروں کا قابو تھا، یا یہ ان کے مالک تھے، تو ہمارے مُلک کے کچھ کاروبار پیسے پیسے کو ترستے تھے۔

اچھا، کیا تم جانتے ہو کہ ہمارے مُلک کی لگ بھگ تین چوتھائی آبادی گاؤں میں رہتی ہے اور اس کا پیشہ عام طور پر کھیتی باڑی ہے، یا اسی

سلسلے کے چھوٹے موٹے کاروبار اور دھندے ہیں؟ جیسے گڑ اور کھنڈساری بنانا، ہاتھ سے کھادی بُننا، بانس کی ٹوکریاں بنانا، کولھو سے تیل نکالنا وغیرہ وغیرہ۔ شہروں میں بھی بڑے بڑے گنتی کے کچھ کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کو چھوڑکر زیادہ تر لوگ چھوٹے چھوٹے کاروباروں میں ہی لگے ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ چھوٹے چھوٹے کارخانوں میں کام کرتے ہیں، کچھ دُکانیں چلاتے ہیں، کچھ لوگ رکشہ، تانگا، موٹر اور ٹیکسیاں چلاتے ہیں، مزدوری کرتے ہیں، عمارتیں بنانے کے کام میں لگے ہوتے ہیں۔ اب تم دیکھوگے کہ اِس قسم کے چھوٹے چھوٹے کاروباروں میں پیسہ تو تھوڑا ہی لگانا پڑتا ہے، لیکن ان میں کام کئی آدمی کرتے ہیں، اور اس طرح کئی آدمیوں کو روزگار یا نوکریاں مل جاتی ہیں۔

کھیتی باڑی کی مثال ہی لے لو۔ اگر کسی آدمی کے پاس دس پانچ بیگھے زمین ہو تو وہ دو بیلوں اور ایک ہل کی مدد سے تھوڑی بہت فصل تو اُگا ہی لیتا ہے۔ مگر ہمارے مُلک کا یہ سب سے بڑا اور سب سے ضروری کاروبار، جِس میں مُلک کے ہر دس آدمیوں میں سے لگ بھگ سات آدمی لگے ہوتے ہیں، شاید مُلک کے سارے کاروباروں میں سب سے پچھڑا ہوا ہے۔ ہمیں ہر سال دوسرے ایسے مُلکوں سے اناج خریدنا پڑتا ہے جو آبادی میں ہم سے بہت کم ہیں اور ان کے پاس اِتنی زمین بھی نہیں ہے جتنی ہمارے پاس ہے۔ کیوں؟ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ کیا ہمارے مُلک کے لوگ کم محنتی ہیں؟ نہیں ایسا بھی نہیں ہے!

اصل میں بات یہ ہے کہ ہمارے مُلک کے کسانوں کے پاس پیسہ نہیں ہے کہ وہ اپنی کھیتی باڑی کو سُدھار سکیں۔ انھیں اچھے مشینی ہل یا ٹریکٹر خریدنے

کے لیے پیسے چاہئیں، اچھے بیج خریدنے کے لیے روپیہ چاہیے، اچھی کھاد کے لیے روپیہ چاہیے، زمینوں کی مٹی کی جانچ کرا کے صحیح وقت پر ٹھیک فصلیں بونی چاہئیں، اور اس کے لیے بھی پیسہ چاہیے۔ ہماری کھیتی کو ہر سال بارش کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ اگر صحیح وقت پر بارشیں نہ ہوں تو بوائی نہیں ہو سکتی، کھڑی فصلیں صرف اس لیے سوکھ کر ختم ہو جاتی ہیں کہ انھیں پانی نہیں مل پاتا۔ اس کے لیے ہمارے یہاں بڑی بڑی نہریں ہونی چاہئیں، یا ہر کھیت میں ٹیوب ویل لگنے چاہئیں۔ اب ان کاموں کے لیے کسان غریب کہاں سے روپیہ لائے!

گاؤں کے مہاجن اور ساہوکار جو روپیہ ان کسانوں کو قرض دیتے تھے اس کی کہانی تو رونگٹے کھڑے کر دینے والی ہے۔ کسانوں کی تین تین نسلیں ایک ہی قرض اُتارنے میں اپنی پوری زندگیاں گزار دیتی تھیں اور اصل تو کیا اس کا سُود بھی نہیں اُتر پاتا تھا۔ مہاجنوں کے دیے ہوئے اسی قرض کے چکّر کی وجہ سے کسانوں کو پیٹ بھر روٹی ملنا بھی مشکل ہو گئی تھی۔

بینک مُلک کی کھیتی باڑی میں ضرور مدد کر سکتے تھے۔ مگر اس میں انھیں دوسرے کاروباروں کے مقابلے میں کچھ کم منافع حاصل کرنے کی اُمید تھی۔ اور ان کے کاروبار کا تو ہمیشہ سے یہی اصول رہا تھا کہ جہاں منافع زیادہ ہو وہیں اُدھار دیا جائے۔ اور پھر ہمارے مُلک کا کسان غریب اور اَن پڑھ تھا۔ اس نے اپنی پوری زندگی میں کسی بینک کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی۔ اس کے پاس کوئی چیز ضمانت رکھنے کے لیے بھی نہیں تھی۔ یہ بیچارہ کیا ہمّت کرتا بینک سے اُدھار لینے کی۔

بینک کے سرمایے پر بڑے بڑے سیٹھوں اور سرمایہ داروں کا قبضہ تھا۔

وہ بڑے بڑے کاروباروں، کارخانوں، ملک کے اندر اور دوسرے ملکوں سے تجارت کے لیے تو پیسہ دے سکتے تھے، چھوٹی موٹی کھیتی باڑی کو کیا اُدھار دیتے۔

ابھی میں تمھیں مثال دوں گا تو یہ بات اور اچھی طرح تمھاری سمجھ میں آجائے گی کہ ہمارے ملک کے بینکوں سے دیے جانے والے اُدھار کو کس طرح تقسیم کیا جاتا تھا۔ مارچ 1967 میں، یعنی بینکوں کے قومی ملکیت میں آنے سے صرف دو سال پہلے اگر ہمارے بینک سو روپیے کی رقم مختلف کاروباروں کے لیے اُدھار دیتے تھے تو ان میں سے لگ بھگ 64 روپیے تو مختلف قسم کے کارخانوں اور صنعتوں کو اُدھار دیے جاتے تھے، لگ بھگ بیس روپیے بیوپار یا تجارت کی طرف چلے جاتے تھے اور صرف دو روپیے ہماری کھیتی باڑی میں لگتے تھے۔ اور اس سے بھی بُری بات یہ تھی کہ کھیتی باڑی کے لیے اُدھار کی یہ رقم ہر سال کم ہی ہوتی جا رہی تھی۔ حالانکہ بینک کے پورے کاروبار میں مستقل بڑھوتری ہی ہو رہی تھی۔

خود صنعتوں میں بھی چھوٹی چھوٹی صنعتوں اور کارخانوں کا یہی حال تھا۔ 1967 میں ہماری چھوٹی صنعتیں ملک کی ساری صنعتی پیداوار کا چالیس فیصدی حصّہ پیدا کرتی تھیں اور بینک سے سو میں سے صرف چھ روپیے انھیں اُدھار مِل پاتے تھے۔

اب جب چھوٹی صنعتوں اور ملک کے سب سے بڑے کاروبار یعنی کھیتی باڑی کے ساتھ بینکوں کی طرف سے ایسا سوتیلے پن کا سلوک ہو رہا ہو تو بتاؤ معمولی دُکانداروں، چھوٹے موٹے کام کرنے والوں، گھریلو دھندوں اور بہت چھوٹے چھوٹے کارخانوں اور کاروباروں کو کون پوچھتا ہوگا۔ اور سچ

پُوچھو تو ہمارے ملک کے پچھڑے پن کی کچھ وجہوں میں سے یہ چیز ایک بہت بڑی وجہ تھی۔

یہ بات تو خیر ٹھیک ہے کہ بینکوں کو منافع کے اصول پر ہی چلایا جاتا ہے، مگر اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی تو کہی جا سکتی ہے کہ جس چیز میں سارے ملک کا فائدہ ہو، یہاں کے ہر شہری کی بھلائی ہو وہ چند آدمیوں کی جیب میں جانے والے منافع سے اچھی چیز ہے۔ اگر تھوڑی دیر کے لیے یہ بات مان بھی لی جائے کہ کسانوں اور چھوٹے چھوٹے کاروباروں اور کارخانوں کو اُدھار دے کر بینک اتنا منافع نہیں کما سکتے جتنا بڑے بڑے بیوپاریوں اور کارخانوں میں روپیہ لگا کر کما سکتے ہیں، تو دوسری طرف اس سے یہ فائدہ بھی تو ہوگا کہ ہمارے ملک کی کھیتی باڑی میں ترقی ہوگی، اناج زیادہ پیدا ہوگا، ہم دوسرے ملکوں سے زیادہ مہنگا اناج منگوانے کے لیے مجبور نہیں ہوں گے، جو روپیے ہم باہر سے اناج منگوانے پر خرچ کرتے ہیں ان سے ایسی مشینیں اور کل پُرزے منگوا سکیں گے جن سے ہماری دوسری پیداوار بھی بڑھے گی۔ ہمارے ملک کے کسانوں کو مہاجنوں اور ساہوکاروں کے چنگل سے چھٹکارہ ملے گا۔ ہمارے چھوٹے چھوٹے کارخانے آگے بڑھیں گے اور عام لوگوں کو روزگار ملے گا اور ملک میں خوشحالی بڑھے گی۔

اب بھائی تم خود ہی سچّی سچّی بات بتانا کہ چند آدمیوں کی جیبوں میں منافع پہنچنا زیادہ بڑی اور اچھی بات ہے یا ملک کی عام جنتا کی بھلائی؟

بس یہی بات تھی جس پر ہمارے مُلک کے بڑے بڑے سوچنے والے اور معاشیات کے علم کے ماہر غور کر رہے تھے اور آخر 1969 میں یہ فیصلہ کر لیا گیا کہ مُلک کے چودہ بڑے بڑے بینکوں کا مالک ہماری پُوری قوم یا مُلک

کو بنا دیا جائے۔ اب ان کے مالک کچھ حِصّے دار نہیں ہوں گے اور بینکوں کے کاروبار کو چلانے میں اور ان کے اصول اور کام کاج کے طریقوں کو طے کرنے میں ان سرمایہ داروں کی رائے نہیں لی جائے گی، ہماری اُس حکومت کی رائے لی جائے گی جِس کے چُننے والے ہم خود ہیں۔ اب ان سے ہونے والا منافع ہماری پُوری قوم کا ہی منافع ہوگا جس سے مُلک کا ہر شہری فائدہ اُٹھائے گا۔

19 جولائی 1969 کو صدرِ جمہوریہ کے ایک حُکم کے ذریعے مُلک کے چودہ بڑے بینکوں کی مِلکیت قوم کو سونپ دی گئی۔ مارچ 1970 میں ہمارے مُلک کی پارلیمنٹ نے اس کو منظوری دے دی اور یہ بینک پُوری طرح اور باقاعدہ طور پر قوم کی مِلکیت بنا دیے گئے۔ ہمارے مُلک میں اُس وقت جِتنا کاروبار ہوتا تھا اس کا 6/7 (لگ بھگ 86 فیصدی) کاروبار انہی چودہ بینکوں کے ذریعے ہوتا تھا جن کو قومی مِلکیت میں لے لیا گیا ہے، جِس کا مطلب یہ ہوا کہ قومی مِلکیت والے بینک کُل کاروبار کے بہت بڑے حِصّے کے مالک ہیں، اور جو بینک قومی مِلکیت میں نہیں آتے ہیں ان کے پاس سرمایہ بھی کم ہے اور کاروبار بھی بہت تھوڑا ہے۔ پھر 'رِزرو بینک' اور حکومت کی کچھ پابندیاں بھی ان پر لگی ہوئی ہیں۔

ہمارے مُلک کی وزیرِ اعظم اِندرا گاندھی نے ان کو قومی مِلکیت میں لیتے وقت اپنی تقریر میں جِن دو باتوں پر زور دیا تھا وہ یہ تھیں کہ:

۱۔ ان بڑے بڑے بینکوں کو قومی مِلکیت میں لینے سے ہم مُلک کی کھیتی باڑی اور چھوٹے چھوٹے کاروباروں، بیوپاروں اور دھندوں کو ان کی ضرورت کے مطابق سرمایہ دے سکیں گے، اور

2۔ مُلک کے اتنے بڑے سرمایے پر سے چند لوگوں کا اثر یا ان کی گرفت ختم ہو جائے گی اور اسے ہمارے مُلک کی حکومت جنتا کی بھلائی اور خوشحالی کے لیے جس طرح مناسب سمجھے گی استعمال کر سکے گی۔

بس بھائی، اب ہم اِس سِلسلے میں تھوڑا سا یہ اور دیکھنے کی کوشش کریں گے کہ بینکوں کے قومی ملکیت میں آجانے سے مُلک اور اس کی جنتا کو کیا فائدے پہنچنے کی اُمید ہو سکتی ہے؟

جب بینکوں کے کاروبار کے اصولوں کو حکومت طے کرے گی اور اس کے سامنے چند لوگوں کے منافعے کی بجائے پُورے مُلک کے فائدے کا مقصد ہوگا تو یہ بینک کے روپیے کو اِس طرح لگائے گی کہ اِس سے جنتا کو اور مُلک کو فائدہ پہنچے، ہماری کھیتی باڑی میں ترقّی ہو، بڑے بڑے کاروباروں اور بیوپاروں کے پھیلاؤ اور ترقّی کے ساتھ ساتھ چھوٹے چھوٹے کاروباروں اور کارخانوں کے لیے بھی سرمایہ موجود ہو ——— ایسے لوگوں کو جو نئے اور کارآمد کاروبار شروع کر سکتے ہیں، اور صرف اِس لیے نہیں کر پاتے کہ ان کے پاس کاروبار شروع کرنے کے لیے پیسہ نہیں ہے، انھیں ضروری سرمایہ مِل سکے گا۔

اور اگر تم دیکھو تو اس کی شروعات ہو بھی گئی ہے۔ اب ہمارے ان قومی بینکوں سے کسانوں، چھوٹے چھوٹے کارخانوں، کاروباروں، آمد و رفت کے ذریعوں (یعنی بسوں، اِسکوٹروں، ٹیکسیوں، رکشاؤں) اور دوسرے مُلکوں کو سامان بھیجنے وغیرہ کے لیے اُدھار دیا بھی جانے لگا ہے۔ ہمارے مُلک کی معاشیات کے ماہروں نے ان چھوٹے چھوٹے کاروباروں کو ایسا حِصّہ

کہا ہے جس پر ہمیں سب سے پہلے توجہ دینی چاہیے۔ اسے تم 'ترجیحی حصہ' کہہ سکتے ہو۔

اب ہم مثال کے لیے تمھیں مُلک کے تمام 59 بڑے بڑے بینکوں سے دیے جانے والے اُدھار کی تقسیم کو دکھاتے دیتے ہیں۔ ان میں وہ چودہ بڑے بینک بھی شامل ہیں جنھیں قومی ملکیت میں لیا جا چکا ہے۔ اس سے تمھیں یہ اندازہ ہو جائے گا کہ ہمارے بینک اب کھیتی باڑی، چھوٹے کاروباروں وغیرہ کو کتنی اہمیت دینے لگے ہیں :

	(1974)		(1975)		بڑھوتری
	*لاکھ روپیے	فیصدی	*لاکھ روپیے	فیصدی	*لاکھ روپیے
1 اناج کے لیے اُدھار	42380	(5.4)	56410	(6-4)	(+) 14030
2 ترجیحی حِصّے کو اُدھار (دوسرے مُلکوں کو سامان بھیجنا بھی شامل ہے)	180200	(11.8)	215010	(24-5)	(+) 34810
(الف) چھوٹی صنعتیں	926660	(11.8)	104290	(12-0)	
(ب) کھیتی باڑی	59880	(7.7)	78500	(8-9)	
(ج) ترجیحی حِصّے میں دوسرے کاروبار —— ذرائع آمدورفت، چھوٹی تجارت وغیرہ۔	27660	3.5	32230	(3-6)	
3 تمام دوسرے حِصّوں کو اُدھار —— بڑے کارخانے، درمیانی درجے کے بیوپار، کاروبار اور بڑی تجارت	560390	71.6	607230	69.1	46840
کُل اُدھار	782970	100.0	878650	100.0	95680

نوٹ: ۱۔ * اُوپر دی گئی رقمیں لاکھ میں لکھی گئی ہیں۔ ان کو پُورا پڑھنے کے لیے ان کے آگے پانچ صفر (00,000) اور بڑھائے جائیں گے۔

۲۔ (الف)، (ب) اور (ج) کی رقموں کو، جنھیں بریکٹ کے اندر دیا گیا ہے، جمع کرنے سے ترجیحی حِصّے کے اُدھار کی رقم بنتی ہے۔ جسے نمبر 2 پر دیا گیا ہے۔

ابھی تھوڑی دیر پہلے تم نے پڑھا تھا کہ 1967 میں ہماری کھیتی باڑی کو بینک کی طرف سے دیے جانے والے اُدھار میں سَو میں سے صرف دو روپیے دیے جاتے تھے، اب 1974 میں 7.7 روپیے اور 1975 میں 8.9 روپیے ہمارے مُلک کے کھیتی باڑی کرنے والوں کو اُدھار مِل جاتے ہیں۔ اِسی طرح چھوٹی صنعتوں کو سَو میں سے صرف 6 روپیے مِلتے تھے اور اب 1974 میں 11.8 اور 1975 میں لگ بھگ بارہ روپیے اُدھار مِل جاتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ اِس کی وجہ سے بڑے کارخانوں اور بیوپاروں کو کچھ تھوڑا سا کم روپیہ مِلتا ہے۔

اور اب تو ہمارے یہ بینک بہت چھوٹے چھوٹے کاروباروں، دُکانداروں، ٹیکسی، اِسکوٹر بلکہ رکشہ چلانے والوں تک کو بہت معمولی سی ضمانت پر اُدھار دینے کے لیے تیار ہیں اور دے رہے ہیں۔

تو بھائی یہ ہے ان بینکوں کے قومی مِلکیت میں آنے کا فائدہ اور اِس کے علاوہ ایک بہت بڑا فائدہ اور بھی ہے جسے ہم ابھی تمھیں سمجھائیں گے۔

تم یہ تو جانتے ہی ہو کہ کسی مُلک کی ترقّی کے لیے ضروری ہے کہ اس میں نئے نئے کاروبار کُھلیں، تجارت میں ترقّی ہو، لوگوں کو روزگار مِلے۔ اور یہ سب چیزیں اُسی وقت ہو سکتی ہیں جب اِس قسم کے نئے نئے کام شروع کرنے کے لیے بینکوں سے خوب روپیہ اُدھار مِل سکے۔ اور پھر اس زنجیر کی اگلی کڑی یہ بھی ہے کہ جب بینکوں کے پاس زیادہ روپیہ جمع ہوگا تب ہی وہ اُدھار بھی زیادہ دے سکیں گے۔

اب اگر ہم اِس زنجیر کی بیچ کی کڑیوں کو تھوڑی دیر کے لیے بھول بھی

جائیں تو بات کچھ یوں نکلتی ہے کہ اگر ہم اپنی آمدنی میں سے بچت کر کے اُسے بینک کے پاس نہیں رکھوائیں گے تو ہمارا مُلک معاشی اعتبار سے ترقّی نہیں کر سکتا۔

اپنی آمدنی میں سے تھوڑی بہت بچت کرنا تو ویسے بھی ضروری ہوتا ہے۔ انسان کی زندگی میں کتنے ہی ایسے بھی وقت آتے ہیں جب اُسے ایک دَم روپیے کی ضرورت پڑ جاتی ہے اور اُس وقت وہ مجبور ہو جاتا ہے کہ یا تو کسی سے اُدھار لے یا اپنی ضرورت کی کوئی چیز اَونے پَونے داموں پر بیچ ڈالے۔ اِسی لیے جو لوگ ملازمت کرتے ہیں وہ اپنے دفتروں میں تنخواہ کا کچھ حصّہ ہر مہینے کٹواتے رہتے ہیں جسے 'پراویڈنٹ فنڈ' کہتے ہیں، جو انھیں ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد مِل جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بھی ایک بچت ہوئی۔ اِسی طرح کچھ لوگ 'انشورنس' کرواتے ہیں اور روپیہ بچاتے ہیں۔ مگر گاؤں اور چھوٹے شہروں میں بھی عام لوگ کچھ نہ کچھ بچت تو ضرور ہی کرتے رہے ہیں۔ مگر یہ بچت کسی کام میں نہیں آتی، بلکہ عام طور پر ضائع ہی ہو جاتی ہے۔ روپیہ اگر گھر کے طاق میں یا بکس کے کونے میں پڑا رہے تو اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا بلکہ کھونے اور چوری ہونے کا کھٹکا اور لگا رہتا ہے۔ عورتیں اگر کچھ بچاتی ہیں تو اس سے سونے چاندی کا زیور بنوا لیتی ہیں اور اس سے بھی عام طور پر چوروں لٹیروں کے علاوہ کسی کو مشکل سے ہی فائدہ پہنچتا ہے۔

اب اگر یہی روپیہ بینکوں میں جمع کروایا جائے تو تم خود سمجھ سکتے ہو کہ اِس سے ہمارے مُلک کو کتنا فائدہ ہوگا۔

مگر ہمارے مُلک میں سارے بینک بڑے بڑے شہروں مین کام کرتے تھے اور عام طور پر انھیں ایک ایسی جگہ سمجھا جاتا تھا جو صرف امیروں اور رئیسوں کے لیے بنائی گئی ہو۔ اِس میں ہماری عام اور غریب جنتا کا بھی کوئی

قصور نہیں تھا۔ بینکوں کے مالک بڑے بڑے سیٹھ، مہاجن اور امیر لوگ تھے سارے بینک انہی کا روپیہ پیسہ جمع رکھتے تھے اور انہی کو اُدھار دیتے تھے۔ اب جب ان کی ملکیت مُلک کے پاس آئی تو بینکوں نے بھی عام جنتا کے پاس پہنچنا شروع کیا۔ گاؤں میں اپنی شاخیں کھولیں اور چھوٹے چھوٹے شہروں میں اپنے جال پھیلا دیے۔ یہاں کی جنتا نے بھی انھیں خوشی سے قبول کرنا شروع کیا۔ اب ہماری جنتا اور گاؤں کے لوگ بھی یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ یہ بینک ان کے اپنے ہیں۔ ان کا اعتبار لوگوں کے دلوں پر قایم ہو رہا ہے۔ انھیں چھوٹے چھوٹے کاروباروں میں پیسہ لگانے کے لیے اُدھار مِلنے کی اُمیدیں پیدا ہو رہی ہیں، اور یہ بھی اب ان میں اپنا روپیہ جمع رکھنا پسند کرنے لگے ہیں۔

ہمارے مُلک میں 1968-69 میں، جِس سال ہمارے بینکوں کو قومی مِلکیت میں لیا گیا ہے، ہر سَو روپیے کی آمدنی میں سے نَو روپیے بچت میں جاتے تھے جنھیں بینکوں وغیرہ کے ذریعے آگے کی پیداوار میں لگایا جاسکتا تھا۔ معاشیات کے عِلم کے بڑے بڑے ماہروں کا خیال یہ تھا کہ جب تک یہ شرح سَو روپیے میں سے بارہ یا تیرہ روپیے نہیں ہوگی ہم اپنے مُلک کے بڑے بڑے منصوبوں کے لیے کافی روپیہ حاصل نہیں کر سکتے۔

جب سے بینک قومی مِلکیت میں آئے ہیں بچت کی اس مد میں ہر سال اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اور اب 1975-76 میں یہ ہر سَو روپے پر تیرہ روپیے تک پہنچ گئی ہے۔ بچت میں اِس اضافے کا اندازہ تم ان رقموں سے لگا سکتے ہو۔

1974-75 کے سال میں ہمارے بینکوں میں کُل 96,32,00,00,000 روپیے جمع کیے گئے تھے۔ اگلے سال یعنی 1975-76 میں جمع کی کُل رقم 114.88.00.00 000 روپیے

ہوگئی۔ اِس کا مطلب ہوا کہ 75-1974 کے مقابلے میں 76-1975 میں بینکوں میں 18,56,00,00,000 روپیے زیادہ جمع ہوئے۔

اِس بڑھوتری کی ایک بہت بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے بینکوں کی شاخیں اب چھوٹے چھوٹے شہروں اور گاوؤں میں پہنچنے لگی ہیں اور جمع کے چھوٹے چھوٹے کھاتے کھُلنے لگے ہیں۔ اور ابھی تو یہ شروعات ہی ہے۔ جیسے جیسے ہمارے مُلک کے عوام کو ان چیزوں کی جانکاری بڑھتی جائے گی اور یہ پُورا چکر ان کی سمجھ میں آتا جائے گا، اپنے فائدوں کو یہ خود ہی محسوس کرنے لگیں گے۔ ہماری بچت بڑھے گی، اور بینک کا کاروبار بڑھے گا اور مُلک کی ترقی کے نئے نئے راستے پیدا ہوتے چلے جائیں گے۔

اِس طرح بینک ہمارے مُلک کے کاروبار، بیوپار، تجارت اور ہماری مالی زندگی کی ترقی کے لیے ایک ایسا ذریعہ ہیں جن کے بغیر آج کے مالی حالات میں کوئی ترقی ممکن نہیں ہے۔ اِس لیے ہم اگر یہ چاہتے ہیں کہ ہمارا مُلک خوشحال ہو، لوگوں کو روزگار مِلنے کے موقعے بڑھیں اور عام آدمی کی زندگی میں آسانیاں پیدا ہوں تو ہمیں چاہیے کہ بینک کے کاروبار کو مُلک میں زیادہ سے زیادہ پھیلائیں۔

کہانی ختم

لو بھائی لگ بھگ آج کے زمانے تک پہنچ کر ہماری کہانی ختم ہو رہی ہے۔ ہم نے اِس کہانی کے ساتھ ساتھ کئی ہزار سال سفر کیا۔ کہیں تیز، کہیں آہستہ۔ ہماری کہانی اور انسان کی زندگی کی رفتار کا رِشتہ کچھ عجیب سا ہے۔ جہاں خود انسان کی زندگی کی رفتار کم تھی۔ یا یہ بہت دھیمی رفتار سے آگے بڑھ رہا تھا وہاں ہم تیزی سے یا سرسری سی نگاہ ڈالتے ہوئے آگے بڑھتے چلے گئے مگر جہاں اس کی

زندگی میں حرکت زیادہ نظر آئی ـــــ اس نے بڑے بڑے بیوپار کیے، کارخانے کھولے، تجارت کو آگے بڑھایا، کاروبار چلائے اور ہر میدان میں تیزی سے آگے بڑھا ـــــ وہاں ہم نے رُک کر اس کے کاموں کو، اور خاص طور پر ایسے کاموں کو غور سے دیکھنے کی کوشش کی جن کا اس کے مال و دولت سے تعلق تھا۔

ہم اِس کہانی کے ساتھ ساتھ مختلف برّاعظموں اور مشرق اور مغرب کے دُور دراز مُلکوں میں بھی گھومے اور یہ دیکھنے کی کوشش کی کہ ہماری اِس سماجی یا معاشی ترقی میں کس کا کتنا حِصّہ رہا۔ لیکن دُنیا کی ہر سائنسی ایجاد اور تمام سماجی اور معاشی ترقیوں میں ایک عجیب بات یہ ہے کہ ایجاد تو ایک شخص یا ایک مُلک کرتا ہے لیکن جو چیز انسان کو کارآمد نظر آتی ہے اس میں پھر ساری دُنیا کا حِصّہ ہو جاتا ہے اور ہر مُلک اپنے اپنے حالات کے مطابق اُسے آگے بڑھانے کی کوشش کرتا ہے۔ تم نے خود دیکھا کہ دُنیا والوں نے جب ایک بار بینک کے نظام کو سمجھ لیا اور پسند کر لیا تو پھر اب شاید ہی کوئی مُلک دُنیا میں ایسا بچا ہو جِس کی پُوری مالی زندگی یا معاشیات بینک کے نظام پر نہ قایم ہو۔

اور اب تو لگ بھگ تیس سال سے ایک 'عالمی بینک' یعنی پُوری دُنیا کا بینک (World Bank) بھی کام کرنے لگا ہے، جِس میں اقوامِ متّحدہ (U.N.O.) کے ممبر شامِل ہیں۔ اِسے مُلکوں کی آپسی امداد اور ایک دُوسرے کی ترقّی میں ہاتھ بٹانے کے مقصد سے قایم کیا گیا ہے۔ جِس طرح عام آدمی اپنے مُلک کے کِسی بینک میں روپیہ جمع کراتا ہے، ضرورت پڑنے پر اپنے کاروبار یا تجارت کے لیے اُدھار لیتا ہے۔ بالکل اِسی طرح 'عالمی بینک' کے تمام ممبر مُلک اِس میں رقمیں جمع کراتے ہیں اور ترقّی کے کاموں کے لیے اُدھار لیتے ہیں۔ مگر بھائی

یہ ایک الگ کہانی ہے جو اب عام تجارتی بینکوں کی اچھّی خاصی لمبی کہانی کے ساتھ تو نہیں سُنائی جا سکتی ۔

اور مجھے یقین ہے کہ یہ کہانی کسی نقطے پر یا کسی وقت بھی ختم نہیں ہوگی۔ اِس لیے کہ یہ ہمارے تمھارے ذہنوں کی ترقّی کی کہانی ہے، انسان کی ترقی کی کہانی، مشکلوں میں آسانیاں تلاش کر لینے کی کہانی۔ یہ مشکل سے مشکل پھندے اور گرہیں کھول لینے اور کٹھن سے کٹھن مسئلوں کو حل کر لینے کی اس خواہش کی کہانی ہے جس نے انسان کو اُس درجے سے جہاں وہ پتّے اور درخت کی چھال لپیٹ کر اپنا جسم ڈھکتا تھا اور غاروں میں گھُس کر خود کو سردی اور گرمی سے بچانے کی کوشش کرتا تھا، آج وہاں پہنچا دیا ہے کہ وہ چاند پر گھوم آیا ہے اور آسمان یا خلار کو اس نے اپنا گھر بنا لیا ہے ۔

اِصطلاحیں

یہ کتاب لکھتے وقت کوشش تو یہی کی ہے کہ مشکل الفاظ اور اصطلاحوں کو استعمال نہ کیا جائے۔ اگر کسی اصطلاح کو استعمال کرنے کی ضرورت بھی پیش آئی ہے تو پہلے مطلب سمجھانے کی کوشش کی ہے پھر وہ لفظ یا اصطلاح بتلا دی ہے۔ لیکن اب اگر کتاب پڑھ چکنے کے بعد تم ان اِصطلاحوں کو کچھ اور اچھی طرح سمجھ لو تو ممکن ہے تمھیں آگے بھی کچھ آسانی ہو۔ اِسی خیال سے انھیں نیچے لکھ دیا ہے اور انگریزی میں ان کے لیے جو لفظ یا اصطلاحیں استعمال ہوتی ہیں اُنھیں بھی لکھ دیا ہے۔

لفظ یا اصطلاح	انگریزی اصطلاح	مطلب
اُدھار (قرض)	Credit	عام آدمی بھی اُدھار لیتا ہے، لیکن آج کل تو ہر بڑا کاروبار، تجارت، بیوپار عام طور پر بینک کے دیے ہوئے اُدھار سے ہی چلتے ہیں۔ بینکوں کے پاس یہ روپیہ اپنا نہیں ہوتا۔ یہ دوسروں کا جمع کروایا ہوا روپیہ ہوتا ہے۔
اُدھار کا پھیلاؤ	Credit Creation	اس اُدھار کا چکّر کبھی کبھی اتنا بڑھ جاتا ہے کہ یہ جمع رقموں سے بھی زیادہ ہو جاتا ہے۔ پُورے مُلک میں کسی وقت جتنا اصلی روپیہ موجود ہوتا ہے اُس سے کہیں زیادہ بینک

سے اُدھار دی جانے والی رقمیں ہوتی ہیں اسی کو اُدھار کا پھیلاؤ کہتے ہیں۔ (دیکھو دوسرا باب)

آمد و رفت کے ذریعے — Transport or Means of Transport

ہمارے مُلک میں چلنے والی ہر سواری —— رکشہ، تانگے سے لے کر ریلوں، ہوائی جہازوں اور پانی کے جہازوں تک —— سب کچھ آمد و رفت کے ذریعوں میں شامل ہیں۔

بل آف ایکسچینج — Bill of Exchange

تاجروں کے درمیان چلنے والے کاروباری کاغذوں میں یہ ایک ایسا کاغذ ہے جو غیر مُلکی تجارت میں روپیے کی ادائیگی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اسے اُردو میں 'تمسّک' کہتے ہیں۔

بیباقی — Clearance

کبھی کبھی ہم ایک بینک کا چیک دوسرے بینک میں جمع کرا دیتے ہیں۔ اِس کی وجہ سے شہر اور مُلک کے ہر بینک کو دوسرے بینک سے کچھ روپیہ لینا ہوتا ہے اور کچھ اُسے ادا کرنا ہوتا ہے۔ یہ حساب آپس میں طے کیا جاتا ہے جسے 'بیباقی' کہہ سکتے ہو۔ 'رِزرو بینک' میں چونکہ مُلک کے سارے بینکوں کا کھاتہ کُھلا ہوتا ہے اِس لیے بینکوں کا یہ آپسی لین دین، یا جمع گھٹاؤ کا حساب بھی وہیں ہوتا ہے۔ اِس

کے لیے 'ریزرو بینک' میں ایک الگ شعبہ ہوتا ہے جسے 'بیباقی کا شعبہ' یا Clearance Department کہتے ہیں۔

بینک ریٹ	Bank Rate	'ریزرو بینک' ملک کے تمام بینکوں کو ضرورت کے وقت اُدھار دیتا ہے اور اس پر سُود لیتا ہے۔ اس سُود کی شرح کو جو 'ریزرو بینک' اپنے اُدھار پر مقرّر کرتا ہے 'بینک ریٹ' کہتے ہیں۔ یہ خیال رکھنا کہ جس سُود کی شرح پر تجارتی بینک بیوپاروں یا کارخانوں کو اُدھار دیتے ہیں اُسے 'بینک ریٹ' نہیں کہتے۔ (دیکھو چوتھا باب)
بینک کار	Banker	جو شخص یا کمپنی بینک کا کاروبار کرے اُسے 'بینک کار' کہا جاتا ہے۔
بینک نوٹ	Bank Note	بینک کی طرف سے چلائے جانے والے 'کاغذی نوٹ' کو 'بینک نوٹ' کہتے ہیں۔ پہلے تو ہر بینک اپنے الگ نوٹ چلاتا تھا اور اگر نوٹ واپس کیا جاتا تھا تو اس کے بدلے میں وہ اصلی سِکّے دے دیتا تھا۔ مگر اب صرف 'ریزرو بینک' کو ہی نوٹ چلانے کی اجازت ہے۔ یہ بھی خیال رکھنا کہ ہمارا ایک روپیہ کا نوٹ 'بینک نوٹ' نہیں کہلاتا۔

یہ تو سرکاری سکّہ ہے لیکن دو روپیے اور
اِس سے اوپر کے نوٹ 'بینک نوٹ' یا
'رزرو بینک' کے نوٹ ہوتے ہیں۔

پراویڈنٹ فنڈ — Provident Fund

سرکاری ملازموں، اُستادوں اور بڑی
بڑی کمپنیوں اور کارخانوں میں کام کرنے
والے لوگوں کی تنخواہوں میں سے ہر مہینے
کچھ رقم کاٹ کر علیحدہ جمع کر دی جاتی ہے
جو ملازمت کے خاتمے پر ملازم کو ایک ساتھ
ادا کر دی جاتی ہے تاکہ بڑھاپے میں کچھ
روپیہ اُسے مل جائے۔ اِسے 'پراویڈنٹ فنڈ'
کہتے ہیں۔

پیسہ، روپیہ، دولت — Wealth

انگریزی کے لفظ Wealth کے معنی بہت
پھیلے ہوئے ہیں۔ اِس میں نقد روپیہ پیسہ، گھر کا
سامان، زمین، مکان، موٹر، غرض ہر قیمتی
چیز آجاتی ہے۔ کسی شخص کے پاس اگر کوئی
ایسی چیز ہے جسے وہ ضمانت میں رکھ کر روپیہ
حاصل کر سکتا ہے، یا کوئی اور قیمتی چیز جسے
بیچ کر یا گروی رکھ کر پیسہ حاصل کر سکتا ہے،
یہ چیزیں بھی اِس لفظ کے معنوں میں شامل
ہو جاتی ہیں۔ بلکہ اگر سچ پوچھو تو ہمارے جسم
کی وہ طاقت اور دماغ کی وہ صلاحیت بھی

جس سے ہم روپیہ کما سکتے ہیں ہماری دولت ہے۔ ہم نے آسانی کے لیے اِسے پیسہ، روپیہ، دولت کہہ دیا ہے۔

پیشہ وری انجمنیں	Guild	ایک سا پیشہ رکھنے والے لوگ — جیسے سُنار، لوہار اور بڑھئی وغیرہ — اپنے کاروبار کی آسانی کے لیے، سامان کی بکری، کچا مال حاصل کرنے، پیدا کیے ہوئے سامان کی قیمتیں طے کرنے اور ایسے ہی کاموں کے لیے اپنی کچھ انجمنیں بنا لیتے ہیں۔ ہندوستان میں ایسی انجمنیں اب سے دو تین ہزار سال پہلے بھی موجود تھیں۔ انھیں انگریزی میں 'گلڈ' کہتے ہیں۔
تبادلہ	Transfer	بینکوں میں صرف چیکوں کے ذریعے ہی رقم ایک نام سے دوسرے نام کے کھاتے میں تبدیل ہو جاتی ہے، اِسے 'تبادلہ' یا Transfer کہا جاتا ہے۔
تبادلہ بینک	Transfer Bank	یوروپ میں کچھ مُلکوں میں صرف اِسی مقصد سے بینک کھولے گئے تھے کہ وہ بیوپاریوں کو یہ آسانی دے سکیں گے کہ جب وہ چاہیں تو ان کا روپیہ ایک کھاتے سے دوسرے کھاتے میں چلا جائے اور انھیں روپیے کی نقد

ادائیگی اور وصولی وغیرہ کی پریشانی میں نہ پھنسنا پڑے۔ ایسے بینکوں کو Transfer Bank کہتے ہیں۔ (دیکھو دوسرا باب)

جمع	Deposit	بینک میں جو روپیہ بھی رکھوایا جاتا ہے وہ جمع یا Deposit کہلاتا ہے۔
جمع سے زیادہ نکلوانا	Over draft	کبھی اگر بینک میں جمع کرانے والے کسی شخص کو اپنی جمع سے زیادہ روپیہ نکلوانے کی ضرورت پیش آجاتی ہے تو بینک کچھ ضمانت لے کر اس کی بھی اجازت دیتے ہیں۔ اسے انگریزی میں Over draft کہتے ہیں۔ یہ ایک طرح سے بینک سے دیا جانے والا اُدھار ہی ہوتا ہے۔
'چارٹر' (منشور)	Charter	حکومت کسی کمپنی یا کسی ادارے کو اگر کسی خاص کام کی اجازت دے دیتی ہے تو اسے 'چارٹر مل جانا' کہتے ہیں۔ جیسے برطانیہ کی حکومت نے 'ایسٹ انڈیا کمپنی' کو ہندوستان میں تجارت کا 'چارٹر' دیا تھا۔ یا حکومت کسی بینک کو نوٹ چلانے کی اجازت دے دیتی ہے۔ ہماری حکومت نے ہندوستان کے رزرو بینک کو دو روپیے اور اس سے زیادہ کے نوٹ چلانے کا چارٹر دے رکھا ہے۔

چیز سے چیز بدلنا	Barter Syestem	ہماری دُنیا میں پہلے لین دین اسی طرح ہوتا تھا کہ ہم اپنی ضرورت سے زیادہ چیز کو کسی دوسرے شخص سے اس کی ضرورت سے زیادہ چیز سے بدل لیتے تھے۔ جیسے گیہوں سے دودھ بدل لیا، یا دودھ سے کپڑا بدل لیا۔ کچھ چھوٹے چھوٹے گاؤں میں آج بھی کبھی کبھی اسی طرح کا لین دین نظر آجاتا ہے۔
چیک	Cheque	وہ کاغذ جس کے ذریعے بینک سے روپیہ نکلوایا جاتا ہے۔ اب تو اس میں زیادہ حصّہ پہلے سے ہی چھپا ہوتا ہے۔ صرف نام، رقم اور دستخط وغیرہ کی جگہ خالی چھوڑ دی جاتی ہے جسے روپیہ نکلوانے والا اپنے قلم سے بھرتا ہے۔
کھلا چیک	Open cheque	(دیکھو تیسرا باب)
کراس چیک	Cross ,,	(دیکھو تیسرا باب)
بیرر چیک	Bearer ,,	(دیکھو تیسرا باب)
ٹریولر چیک	Traveller ,,	(دیکھو تیسرا باب)
حِصّہ	Share	آج کل زیادہ تر بڑے بڑے کاروباروں اور کارخانوں کا مالک عام طور پر کوئی ایک آدمی نہیں ہوتا۔ کارخانہ یا کاروبار چلانے کے لیے جتنے روپیے کی ضرورت ہوتی ہے اُسے لوگوں سے ہی اُدھار لیا جاتا ہے۔ ضرورت کے سارے

روپیے کو برابر حصّوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔
اور ان حصّوں کو بازار میں بیچا جاتا ہے۔ جیسے
ایک لاکھ روپیہ جمع کرنے کے لیے اِسے سَو
سَو روپیے کے ایک ہزار حِصّوں میں بانٹا
جا سکتا ہے۔ اب جو شخص جتنے حِصّے چاہے
خرید سکتا ہے۔ اس کا منافع یا نقصان ہر سال
حِصّے داروں کو ان کے حِصّوں کی تعداد کے
حساب سے تقسیم کر دیا جاتا ہے۔

حِصّہ دار — Shareholder
جو لوگ یہ حِصّے خریدتے ہیں انھیں ’حِصّہ دار‘
کہا جاتا ہے۔

حِصّہ داری کاروبار — Limited Company
Corporation
Joint Stock Company
اُوپر جس قسم کے کاروبار کا ذِکر کیا گیا اسے
’حِصّے داری کاروبار‘ کہا جاتا ہے۔ انگریزی
میں اِس کے کئی نام ہیں۔

دوسرے مُلکوں سے سامان
منگوانا (درآمد) — Import

دوسرے مُلکوں کو سامان
بھیجنا (برآمد) — Export

اب دُنیا میں کوئی مُلک ایسا نہیں ہے جو صرف
اپنے ہی علاقے میں پیدا ہونے والے سامان
سے اپنا سارا کام چلالے۔ عام طور پر ہر مُلک کو
اپنی ضرورت کا کچھ سامان دوسرے مُلکوں
سے منگوانا پڑتا ہے اور اس کے بدلے میں اپنے
یہاں سے کچھ سامان بھیجنا پڑتا ہے۔ جو سامان
باہر سے ہمارے مُلک میں آتا ہے اُسے ’درآمد‘
کہتے ہیں اور جو باہر جاتا ہے اُسے ’برآمد‘ کہتے

ہیں۔ مثال کے طور پر ہندوستان چائے، ابرق، کاجو، پٹ سن، چینی وغیرہ 'برآمد' کرتا ہے اور بڑی بڑی مشینیں، مٹی کا تیل، پٹرول اور کبھی کبھی اناج 'درآمد' کرتا ہے۔ دوسرے ملکوں سے اس تجارت کو غیر ملکی تجارت کہتے ہیں۔

غیر ملکی تجارت — Foreign Trade

دیوالیہ — Bankruptcy

جب کسی بیوپاری، کارخانے دار، سیٹھ، مہاجن یا بینک وغیرہ کے پاس اتنا روپیہ یا سامان باقی نہیں رہتا کہ وہ اپنے قرضوں کو چکا سکے اور ضروری خرچوں کو پورا کر سکے تو اُسے 'دیوالیہ' ہوجانا یا 'دیوالہ نکل جانا' کہتے ہیں۔

ڈیمانڈ ڈرافٹ — Demand Draft

بینک کے ذریعے اگر کسی کو روپیہ بھجوانا ہو تو ایک طریقہ تو چیک کے ذریعے ادا کر دینے کا ہے اور دوسری طرح 'ڈیمانڈ ڈرافٹ' سے بھی ادا کیا جا سکتا ہے۔ چیک تو صرف وہی آدمی دے سکتا ہے جس کا روپیہ بینک میں جمع ہو لیکن 'ڈیمانڈ ڈرافٹ' کسی بینک سے نقد روپیہ دے کر بھی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اور چونکہ اس میں روپے کی ادائیگی پہلے ہی کر کے ڈرافٹ پر لکھوا دیا جاتا ہے اس لیے جس کے پاس یہ ڈرافٹ پہنچتا ہے

اُسے نقد روپیہ حاصل کرنے کے لیے بہت زیادہ دن انتظار نہیں کرنا پڑتا۔ وصول کرنے والا اسے اپنے بینک میں جمع کرا دیتا ہے اور ایک دو دن میں ہی روپیہ مل جاتا ہے۔

روپیہ، پیسہ	Money	تمام سکّے، نوٹ یا دو چیزوں کے لین دین کے بیچ میں جو چیز بھی کبھی ڈالی گئی ہو اُسے ہم روپیہ پیسہ کہہ سکتے ہیں۔ انگریزی میں اب اس کے لیے صرف Money استعمال ہوتا ہے۔ تم آگے چل کر اُردو میں اِس کے لیے 'زر' کا لفظ پڑھوگے۔
روپیہ لگانا	Investment	دُنیا کے ہر کاروبار، کارخانے یا تجارت کے شروع کرنے میں کچھ روپیہ خرچ کرنا پڑتا ہے۔ جیسے کارخانہ بنوانے، زمین خریدنے، مشینیں خریدنے، ملازموں کو تنخواہیں دینے وغیرہ کے لیے روپیہ خرچ کیا جاتا ہے۔ اِسے کاروبار میں روپیہ لگانا کہتے ہیں۔
روپیہ نکلوانا	Withdrawl	بینک میں جمع کی ہوئی رقم میں سے کچھ روپیہ واپس لیا جاتا ہے تو اسے 'روپیہ نکلوانا' یا Withdrawl کہتے ہیں۔
زرِ مبادلہ یا غیر مُلکی زرِ مبادلہ	Foreign Exchange	دوسرے مُلکوں سے سامان کی خرید و فروخت کے وقت اپنے مُلک کا روپیہ تو کام نہیں آسکتا۔

		اس لیے ہر مُلک کو بہت سی باتوں کا خیال رکھتے ہوئے یہ طے کرنا پڑتا ہے کہ وہ اپنے مُلک کے روپیے کے بدلے میں دوسرے مُلک کا کتنا روپیہ لے یا دے ـــــ جیسے آج کل ہمیں انگلینڈ میں چلنے والے ایک پونڈ کے بدلے میں لگ بھگ اٹھارہ روپیے دینے پڑتے ہیں، یا امریکی ڈالر کے بدلے میں لگ بھگ نَو روپیے۔ اِس حساب کو یا اس غیر مُلکی روپیے کے لین دین کو 'غیر مُلکی زرِ مبادلہ' کہتے ہیں۔
سرمایہ	Capital	کسی بیوپار، کارخانے، بینک یا کاروبار میں جتنا روپیہ پیسہ بھی لگا ہوتا ہے اُسے اس کاروبار کا سرمایہ کہتے ہیں۔ یہ سرمایہ نقد روپیے کی شکل میں بھی ہو سکتا ہے، عمارت کی شکل میں بھی اور مشینوں اور اوزاروں کی شکل میں بھی۔ ایک طرح سے کسی کارخانے یا کاروبار کے پاس جو بھی چیز ایسی ہو جسے آگے کی پیداوار میں استعمال کیا جا سکے اُسے اس کا سرمایہ کہتے ہیں۔
ابتدائی سرمایہ	Initial Capital	کسی بیوپار کو شروع کرتے وقت جو روپیہ یا سرمایہ لگایا جاتا ہے اُسے 'ابتدائی سرمایہ' کہتے ہیں۔
صنعت	Industry	مُلک کے کارخانوں کو مُلک کی صنعت کہتے ہیں۔

اگر مُلک میں صنعتیں زیادہ ہوتی ہیں تو وہ زیادہ خوشحال ہوتا ہے۔ وہ زیادہ سامان پیدا کرتا ہے اور وہاں لوگوں کو روزگار ملنے کے موقعے زیادہ ہوتے ہیں۔

بڑی صنعت	Large Scale Industry	بہت بڑے بڑے کارخانے جن میں سیکڑوں بلکہ ہزاروں آدمی کام کرتے ہیں اور بڑی بڑی مشینوں کے ذریعے پیداوار ہوتی ہے 'بڑے پیمانے کی صنعت' کہلاتی ہے۔ جیسے ہمارے مُلک میں لوہے کی صنعت۔ نسبتاً چھوٹی
درمیانی صنعت	Medium Scale Industry	صنعتوں کو 'درمیانی' اور بہت چھوٹے چھوٹے کارخانوں کو جن میں دس، بیس، پچاس آدمی کام کرتے ہیں 'چھوٹی صنعتیں' کہتے ہیں۔
صنعتی پیداوار		ہر مُلک کی اس ساری پیداوار کو جو اُس کے کارخانے پیدا کرتے ہیں وہاں کی 'صنعتی پیداوار' کہتے ہیں۔ ہمارے مُلک میں تیار کیا جانے والا لوہا، کپڑا، ہوائی جہاز، پانی کے جہاز، مشینیں اور نہ معلوم کتنی چیزیں سب ہماری صنعتی پیداوار ہیں۔
ضمانت	Security	بینک سے یا کسی اور ایسے ہی اِدارے سے اُسی وقت اُدھار مل سکتا ہے جب کوئی ضمانت رکھوائی جائے۔ ضمانت کسی بھی شکل میں

ہوسکتی ہے۔ مکان، قیمتی چیزیں جیسے زیور، زمین کے کاغذات، کاروبار کی ملکیت کے کاغذ وغیرہ وغیرہ۔

قدر — Value — ہمارے استعمال کی ہر وہ چیز جس سے ہمیں زندگی گزارنے میں مدد ملتی ہے اس کی کچھ نہ کچھ قدر ہمارے دماغ میں بن جاتی ہے۔ جیسے ہم ایک میز کے بدلے میں دو کرسیاں بدل سکتے ہیں۔ دونوں کی قدر ہمارے لیے برابر ہے۔ اگر یہ قدر ہمارے ذہن میں نہ ہو تو ہم اسے خریدنے کے لیے کبھی بھی تیار نہ ہوں۔ عام زندگی میں ہم کسی چیز کی قدر کو پیسے سے ہی نلپتے ہیں جیسے ایک پنسل کی قدر ہمارے لیے تیس پینتیس پیسے کے برابر ہے۔ اگر کوئی ہم سے کہے کہ یہ پنسل دس روپے میں خرید لو تو ہم کہیں گے کہ ہمارے لیے اس کی اتنی قدر نہیں ہے۔ کسی چیز کی قدر کو جب

قیمت — Price — روپے پیسے کی شکل میں ظاہر کرتے ہیں تو اسے 'قیمت' کہا جاتا ہے۔

قومی ملکیت — Nationalisation — عام طور پر کسی کاروبار، کارخانے وغیرہ کا مالک یا تو کوئی ایک آدمی ہوتا ہے یا پھر کچھ لوگ اس کے حصے خرید لیتے ہیں اور یہ

کاروبار 'حصّے داری کاروبار' کہلاتا ہے۔ لیکن
اب معاشیات کے عالموں کا خیال یہ ہے کہ
بعض کاروبار ایسے ہیں جن کی مِلکیت کسی
ایک شخص یا چند حِصّے داروں کے پاس نہیں
ہونی چاہیے، بلکہ پُوری قوم یا مُلک کو ہی
ان کا مالک ہونا چاہیے۔ ان ماہروں کا
کہنا یہ ہے کہ چونکہ ایسے کاروباروں سے مُلک
کی پُوری جنتا کا بھلا ہوتا ہے اور ان کے
بغیر مُلک کی ترقّی میں رُکاوٹ پیدا ہوتی ہے
اِس لیے انھیں صرف فائدہ کمانے کے مقصد
سے نہیں چلایا جانا چاہیے بلکہ مُلک اور عوام
کی بھلائی ان کا مقصد ہونا چاہیے۔ چنانچہ
ہمارے مُلک میں چند بڑے بڑے کاروباروں
کو 'قومی مِلکیت' کے کاروبار کہتے ہیں۔ اِس
کی سب سے بڑی مثالیں ہمارے مُلک کی
ریلیں، ڈاک تار کا کاروبار، انشورنس اور
اب تازے طور پر قومی مِلکیت میں آنے
والے بینک ہیں۔ (دیکھو پانچواں باب)

'کاغذی وعدہ' I.O.U.

انگریزی کے یہ تین حرف معاشیات کے عِلم
میں بڑے دلچسپ ہیں۔ یہ اصل میں انگریزی
کے تین لفظوں یعنی I Owe you ـــ کا

مخفف ہیں جن کے لفظی معنی ہوتے ہیں" میں قرض دار ہوں آپ کا"۔ اب ذرا یہ دیکھو کہ چاہے ان لفظوں کو پورا پورا پڑھو یعنی 'I Owe you' یا ان کے مخفف حرفوں کو یعنی .I.O U — آواز دونوں طرح ایک ہی نکلتی ہے۔ اگر تم کسی کاغذ پر کسی دوست کو یہ لکھ کر دے دو 'میں آپ کا.... روپیے کا قرض دار ہوں، تو اسے تم 'کاغذی وعدہ' یا انگریزی میں .I.O.U کہہ سکتے ہو۔ بینکوں کے چلائے ہوئے نوٹ بھی پہلے اسی نام سے جانے جاتے تھے۔ اب بھی بہت سے کاروباروں میں اسی قسم کے 'کاغذی وعدے' کام میں آتے ہیں۔

کھاتہ — Account Deposit

جب تم بینک میں روپیہ جمع کراتے ہو تو تمھارا ایک کھاتہ کھول دیا جاتا ہے۔ اسے انگریزی میں Bank Account کہتے ہیں۔ یہ کھاتہ روپیہ جمع کراتے وقت بھی کھولا جاتا ہے اور اگر بینک سے اُدھار لو تب بھی تمھارے نام پر یہ روپیہ جمع کر کے ایک کھاتہ کھول دیا جاتا ہے۔ بینک کھاتے، کی بہت سی قسمیں ہوتی ہیں۔ جب کسی کے

عارضی یا وقتی کھاتہ — Demand Deposit

قایم کھاتہ — Fixed Deposit

مُدتی یا میعادی کھاتہ — Time Deposit

جاری کھاتہ — Recurring Deposit

کھاتہ نمبر — Account Number

نام پر کوئی کھاتہ کھولا جاتا ہے تو جمع کرانے والے
کے نام کے ساتھ اس کا ایک نمبر بھی لکھا جاتا ہے
تاکہ اس کی پہچان آسانی سے ہو سکے۔ (دیکھو تیسرا باب)

لاکر — Locker

روپیہ جمع رکھنے کے ساتھ ساتھ بینک ایک کام یہ
بھی کرتے ہیں کہ آپ کی قیمتی چیزیں جیسے زیور،
ہیرے جواہرات، ضروری کاغذات وغیرہ کو بھی
حفاظت کے لیے اپنے پاس جمع کر لیتے ہیں۔
اس کے لیے یہ بہت مضبوط تجوریوں جیسے ڈبّے
ہر جمع کرانے والے کو دیتے ہیں جن میں یہ اپنی
چیزیں خود رکھتا ہے اور خود ہی نکالتا ہے اور
اس کی چابی بھی اسی کو دے دی جاتی ہے۔
اس تجوری کو 'لاکر' کہتے ہیں۔

لین دین — Exchange

جب دو آدمی کسی چیز کو کسی دوسری چیز سے
بدل لیتے ہیں تو اُسے 'لین دین' یا 'Exchange'
کہتے ہیں۔ یہ دو چیزوں کے درمیان بھی ہو سکتا
ہے اور چیز اور روپیے پیسے کے درمیان بھی۔
یہی بات تو ہم سامان خریدتے وقت کرتے ہیں۔
دُکان پر رکھی ہوئی چیز کو ہم اپنی جیب میں
پڑے ہوئے روپیے پیسے سے بدل لیتے ہیں۔
اس لفظ کے ساتھ اگر تم کچھ پہلے دیے گئے لفظ
'قدر' کو بھی پڑھو تو تمھاری سمجھ میں یہ بات بھی

آئے گی کہ ہم انہی دو چیزوں کا لین دین کرتے ہیں جن کی قدر ہمارے دماغ میں ہوتی ہے۔

لین دین کے بیچ کی تیسری چیز یا لین دین کا ذریعہ Medium of Exchange

شروع شروع میں تو لوگ کچھ اس طرح کرتے تھے کہ اپنی کسی چیز کے بدلے میں ضرورت کی کوئی اور چیز کسی دوسرے سے بدل لیتے تھے۔ مگر اس میں بڑی دِقّت پیش آتی تھی۔ کبھی وہ آدمی نہ ملتا جس کے پاس وہ چیز ہو جو ہمیں چاہیے۔ کبھی اگر ایسا آدمی مل بھی جاتا تھا تو وہ اُس چیز کو لینے کے لیے تیّار نہ ہوتا جو ہم دینا چاہتے تھے۔ اِسی لیے لوگوں نے اپنے لین دین میں کسی تیسری چیز کو ڈالنا شروع کر دیا۔ جیسے اناج کو بھیڑ یا بکری سے بدل لیا اور پھر بھیڑ یا بکری سے کپڑا بدل لیا۔ ہوتے ہوتے بہت دن بعد دھات کے سِکّے اِسی کام میں آنے لگے۔ یہی بیچ کی چیز، چاہے وہ بھیڑ یا بکری ہو، سیپ یا کوڑی ہو، یا سونے چاندی کے سِکّے یا کاغذ کے نوٹ ہوں —— یہ سب لین دین کا ذریعہ Medium of Exchange کہلاتے ہیں۔

محفوظ سرمایہ Reserve

بینکوں کا کام ہے لوگوں کا روپیہ جمع رکھ کر اِسے دوسرے لوگوں، کارخانوں، کاروباروں

وغیرہ کو اُدھار دینا۔ مگر بینک سارا روپیہ اُدھار نہیں دے دیتے۔ تھوڑا بہت ہمیشہ اپنے پاس محفوظ ضرور رکھتے ہیں تاکہ ضرورت کے وقت انھیں پریشانی نہ ہو۔ صرف بینک ہی نہیں تمام اچھّے اور بڑے کاروبار، بیوپار اور کارخانے بھی اپنا سارا روپیہ اور سرمایہ ایک دَم خرچ نہیں کر دیتے۔ تھوڑا سا محفوظ رکھ لیتے ہیں۔ اِس محفوظ رقم کو 'Reserve' ' ' کہتے ہیں۔

معاشیات **Economics**

اب تک تمھاری سمجھ میں یہ بات آگئی ہو گی کہ وہ مضمون جِس میں ہمارے روپیے پیسے کے معاملات اور ہماری زندگی کے اُس حِصّے کے متعلق تعلیم حاصِل کی جاتی ہے جو اس کی مالی خوشحالی سے تعلق رکھتا ہے، 'معاشیات' یا ' Economics ' کہتے ہیں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

Rs. 16/-

ISBN : 978-81-7587-380-3

कौमी काउन्सिल बराए फरोग़-ए-उर्दू ज़बान

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

National Council for Promotion of Urdu Language

Ministry of HRD, Department of Higher Education, Government of India

FC-33/9, Institutional Area, Jasola, New Delhi-110 025